ماہنامہ

بیداری

حیدر آباد

جلد بائیسواں ◯ فروری-مارچ 2026

قیمت: 25روپے، سالانہ: 300روپے

مدیر

☆☆☆

حافظ محمد موسیٰ بھٹو

موبائل نمبر:

03463216078

زیر اہتمام

☆☆☆

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد

E-MAIL

m.moosabhutto@gmail.com

www.bedarimillat.com

قرآن کا پیام (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۲
ہمارے نام		
اکیسویں صدی کی کشمکش (زلمے خلیل زاد کی بیوی کی کتاب)	عبدالکریم	۷
نوجوان نسل میں خودکشیوں اور	ڈاکٹر قیصر علی	۱۵
نشے کا بڑھتا ہوا رجحان اور اس کا حل		
مسلمانوں کو درپیش مسائل اور اسلامی اعتبار سے ان کا حل	محمد موسیٰ بھٹو	۳۳
امت مسلمہ کی حالت زار		۳۸
قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں نظام تعلیم کا کردار	محمد موسیٰ بھٹو	۴۰
بڑا بننے اور فساد پھیلانے کی سزا		۴۹
اچھا انسان بننا ہم سب کی ضرورت	محمد موسیٰ بھٹو	۵۲
مصروفیت کے باوجود وقت نکالنے کا طریقہ کار	تحریر مولانا عبدالمتین	۵۴
چند گزارشات		
شبیر کی خودکشی کی المناک واردات	تبسم مصباح	۵۶
مذہبی ہم آہنگی اور وحدت ادیان کا فتنہ	محمد طفیل کوہاٹی	۶۳
کیا مذہب ایک نشہ ہے؟	شاہنواز فاروقی	۶۶
توحید اور غیر سائنسی افکار و توہمات	مولانا محمد حنیف ندوی	۷۰
ہمارے کچھ اہم معاملات	محمد موسیٰ بھٹو	۷۲
احادیث نبوی کی روشنی میں		

پبلشر: محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

قرآن کا پیام

ہمارے نام

آخرت کے گھر کا پرہیزگاروں کے لئے ہونا

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (سورۃ اعراف آیت ۱۶۹) (اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں)۔

آخرت کا گھر تو صاحب تقویٰ افراد ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے، یہ وہ افراد ہیں جو دنیاوی زندگی پر آخرت کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں، جو اللہ کا کھٹکہ رکھتے ہیں کہ انہیں اللہ کے سامنے پیش ہو کر اپنی ساری زندگی اور سارے اعمال کا حساب کتاب دینا ہے، وہ اسی کھٹکے کے زیر اثر زندگی گذارتے ہیں، تقویٰ کی یہی حالت ان کا شعار بن جاتا ہے، تقویٰ کی اس حالت کو مستحکم کرنے کے لئے وہ مجاہدوں سے کام لیتے ہیں، یہ مجاہدے اللہ کے ذکر اور عبادت کے حوالے سے ہوتے ہیں، جس سے ان پر اللہ کا استحضار غالب ہونے لگتا ہے۔

حق کا راستہ بتانے والے خوش قسمت افراد

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۔ (سورۃ الاعراب آیت ۱۸۱) (اور ہماری مخلوقات میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں)۔

حق کا راستہ بتانے والے افراد خوش نصیب ہوتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے حالات میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں، جس حق کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے ہیں، ان کی اپنی زندگی کا نمونہ اس حق کے عین مطابق ہوتا ہے۔

ایسے افراد دراصل علمائے ربانی ہوتے ہیں، ایک حدیث شریف میں انہیں بنی اسرائیل کے انبیاء کے مثل قرار دیا گیا ہے، دین کی تعلیمات کا تسلسل انہی کی کوششوں سے جاری اور ساری رہتا ہے، یہ اللہ کی مخلوق میں سب سے بہتر لوگ ہوتے ہیں کہ اپنی دنیا و آخرت بنانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی آخرت بنانے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، ایسے بے غرض اور مخلص داعیوں کی سرگرمیوں سے ہی معاشرے کی اصلاح کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

اللہ کی نعمت کا دل کی بہتر حالت سے وابستہ ہونا

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (سورۃ الانفال آیت ۵۳) (یہ اس لئے کہ اللہ کسی قوم کو جو نعمت دیتا ہے جب تک وہ خود اپنے دلوں کی حالت کو نہ بدلیں اللہ انہیں نہیں بدلا کرتا)۔

اس آیت میں یہ نکتہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو نعمت عطا فرمائی جاتی ہے، وہ دل کی بہتر حالت کی وجہ سے فرمائی جاتی ہے، اور اس وقت تک نعمت کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، جب تک دل میں فساد برپا نہیں ہوتا، جب دل میں فساد برپا ہوگا، دنیا پرستی کا میلان غالب ہوگا تو وہ نعمت سلب کر لی جاتی ہے، یعنی بندوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ ان کے دلوں کی حالت کے پیش نظر ہوتا ہے، جس طرح دل کی حالت ہوگی، اسی طرح کا اللہ کا بندوں کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ پاکباز دلوں کی حالت ہی اللہ کے انعامات کو اپنے ساتھ لاتی ہیں، اس لئے دلوں کی حالت کو بہتر بنانے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، اس دور میں یہی وہ کام ہے، جسے غیر اہم سمجھکر نظر انداز کیا ہے، جس کی وجہ سے ہم اللہ کی نعمتوں سے محرومی کی سزا بھگت رہے ہیں۔

دنیا اور آخرت دونوں میں سے ایک کی چاہت کا ہونا

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ۔ (سورۃ الانفال آیت ۶۷) (تم دنیا چاہتے ہو جب کہ اللہ آخرت چاہتا ہے)۔

اس آیت میں فرد کی نفسیات کی نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ وہ دنیا سے غیر معمولی رغبت رکھتا ہے، اور اس پر دنیا کی فکر مندی غالب رہتی ہے، جب کہ آخرت کی زندگی ایسی ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی حیثیت چند لمحوں سے زیادہ نہیں، اس لئے اللہ کی چاہت ہے کہ مومنوں پر آخرت کی فکر مندی غالب ہو، تاکہ ان کی سرگرمیوں کا ہدف دنیا کے بجائے آخرت بن جائے۔

جب تک اللہ سے محبت غالب نہیں ہوتی، تب تک دین اور دنیا کے درمیان کشمکش کی حالت موجود ہوتی ہے، اللہ کی محبت کے غالب ہونے کے بعد ہی فرد کی دنیا کے بارے میں غیر معمولی حساسیت کم ہونے لگتی ہے، اس کے باوجود دنیا کی چاہت سے محتاط ہونا ناگزیر ہے۔

دل کی حالت بہتر ہونے سے

عطا فرمانے کا وعدہ

اِنۡ یَّعۡلَمِ اللّٰہُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ خَیۡرًا یُّؤۡتِکُمۡ خَیۡرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنۡکُمۡ۔ (سورۃ الانفال آیت ۷۰) (اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی معلوم کرے گا تو جو (مال) تم سے چھن گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عنایت فرمائے گا)۔

اس آیت میں بھی دلوں کی بہتر حالت پر اللہ کی طرف سے مال عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا گیا ہے، بہتر دلوں کی علامت میں مال کی محبت کا نہ ہونا ہے، جب مال کی محبت نہ ہو تو اللہ کی طرف سے مال عطا ہوتا ہے تو مال سے بے نیازی کی حالت میں اضافہ ہوتا ہے، البتہ چونکہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے مال مطلوب ہوتا ہے، اس لئے اللہ کی طرف سے نیکی سے رغبت والے دلوں کو مال عطا فرمایا جاتا ہے اور ایسے افراد کو لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاتا، نہ انہیں دوسروں کا محتاج بنایا جاتا ہے۔

بُرائی کا آگ کی خاصیت رکھنا

وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡھُھُمۡ فِی النَّارِ۔ (سورۃ النمل آیت ۹۰) (جو بُرائی لے کر آئے گا تو اس کو آگ میں منہ کے بل اوندھے پھینک دیا جائے گا)۔

یہ آیت ایسی ہے جو بندہ مومن کو سخت متفکر کر دیتی ہے کہ جب بُرائی کی یہ سزا ہے تو زندگی میں نہ معلوم اس سے کتنی بُرائیاں صادر ہوئی ہوں گی، اس کی کل بُرائیوں کی جو سزا ہوگی وہ تو بہت زیادہ ہوگی۔

یہ تو حقیقت ہے کہ بُرائی کی خاصیت آگ کی سی ہے، بُرائی آگ کے اثرات رکھتی ہے، آخرت میں یہ آگ جہنم کی صورت میں ہوگی۔ اس دنیا میں بھی بُرائی سے دل اور روح میں آگ سی لگ جاتی ہے، لیکن بندہ مومن کو امید ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کے ساتھ آسانی اور فضل کا معاملہ ہوگا اور اس کی طرف سے اسے جن اعمال کی توفیق نصیب ہوئی ہے، ان اعمال کی وجہ سے اس کے گناہوں سے صرف نظر کیا جائے گا، دوسری آیات میں بندہ مومن کو تسلی دلائی گئی ہے کہ توبہ سے اس کے سارے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا، قرآن میں بعض آیات میں تفصیل موجود ہوتی ہے تو بعض میں اجمال، اجمال پر مبنی اس طرح کی آیات سے تشویش ہوتی ہے، لیکن تفصیلی آیات سے حوصلہ ملتا ہے، بہر حال بندہ مومن ہر طرح کے حالات میں اللہ کے فضل خاص کا محتاج ہے کہ اس کے بغیر اس کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔

آسائش و راحت کے حامل افراد کے حالات کی عکاسی

وَلٰکِنۡ مَّتَّعۡتَھُمۡ وَاٰبَآءَھُمۡ حَتّٰی نَسُوا الذِّکۡرَ ۚ وَکَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا۔ (سورۃ الفرقان آیت ۱۸) (لیکن تو نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو آرام و آسائش (کا سامان) عطا کیا یہاں تک کہ وہ تیرے ذکر کو بھول گئے، اس طرح وہ ہلاک و برباد ہو گئے)۔

آسائش اور راحت کے سامان میں کچھ اس طرح کی خاصیت رکھی گئی ہے کہ اللہ اور مالداروں میں عام طور پر حجابات پیدا ہو جاتے ہیں، اس طرح کے افراد کی اللہ کے ذکر سے طبعی مناسبت پیدا ہی نہیں ہو پاتی اور وہ اللہ کے ذکر سے غفلت میں زندگی گذارنے لگتے ہیں، آسائش وراحت کے سامان کے حامل افراد کے دنیاداری سے متعلق معاملات کے سلسلے میں تو نئے نئے نقشے سامنے آتے رہتے ہیں، لیکن اپنے حقیقی خالق ومالک کے بارے میں ان کی حس کام نہیں کرتی، وہ اللہ کے ذکر کو بھول ہی جاتے ہیں، اس آیت میں مالداروں کی حالت کی پوری طرح عکاسی فرمائی گئی ہے۔

اہل اللہ ہمیشہ آسائش وراحت کے سامان سے دور رہتے ہیں، اس لئے کہ اس سے غفلت کا مزاج پیدا ہونے لگتا ہے، چنانچہ بعض اہل اللہ کا قول ہے کہ جب تک دنیاداروں والے راحت وآسائش کے سامان سے کراہت پیدا نہیں ہوتی، تب تک کام نہیں بنتا، یعنی تب تک اسلامی مزاج سے پوری طرح ہمہ آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی۔

یہ نکتہ ذہن نشین ہونا ضروری ہے کہ اللہ کا ذکر جو مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے وہ راحت وآسائش کے حامل فرد کے مزاج کے بالکل متصادم ہوتا ہے، دونوں کا راستہ اور مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

عبدالکریم

اکیسویں صدی کی کشمکش
(زملے خلیل زاد کی بیوی کی کتاب)

یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

موسیٰ وفرعون یا ابراہیم ونمرود دو ازلی ابدی کردار ہیں۔ کوئی زمانہ بھی ان دو کرداروں سے خالی نہیں رہا۔ ایک روشنی ہے تو دوسرا تاریکی ہے۔ ایک علم ہے تو دوسرا جہل ہے۔ ایک سعادت ہے تو دوسرا شقاوت ہے۔ ایک دن ہے تو دوسرا رات ہے۔ ایک عدل ہے تو دوسرا ظلم ہے۔ ایک احسان ہے تو دوسرا طغیان ہے۔ ایک سلامتی ہے تو دوسرا تباہی ہے۔ ایک صحت ہے دوسرا بیماری ہے۔ ایک صالحیت ہے دوسرا شیطانیت ہے۔

پس لازم ہے ایک کا وجود دوسرے کو معدوم کردے۔ ایک کی ترقی دوسرے کی تنزلی قرار پائے۔ ایک کی شوکت دوسرے کی ذلت ٹھہرے۔ اس سلسلے میں ایک زبردست معرکہ آرائی ان دونوں کرداروں کی بنیادی ضرورت ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

ہزاروں سال سے یہ معرکہ آرائی جاری وساری ہے۔ کبھی اس نے طالوت کو جالوت سے ٹکرایا اور جالوت پاش پاش ہوا۔ یوشع کو عمالقہ سے ٹکرایا تو عمالقہ پاش پاش ہوا۔ النبی الملاحم ﷺ کو ابوجہلوں سے ٹکرایا تو عرب نور نبوت سے منور ہوا۔ صلاح الدین کو صلیبیوں سے دوبدو کیا تو صلیبی ٹڈی دل ناکام لوٹ گیا۔ اسی طرح بیسویں اور اکیسویں صدی کے افغانی

ملاوں و عربی شہزادوں نے آج کے ابوجہلوں کو زچ کیا تو عصر حاضر کا فرعون امریکہ اس کھوج میں لگ گیا کہ اس معرکہ آرائی کا خاتمہ کیسے ہو۔اس لیے اس نے ان اسباب کا جائزہ لیا جن سے اس معرکہ آرائی کو فروغ ملتا ہے۔ تھنک ٹینکس نے اپنی رپورٹیں بنائیں۔ بڑے بڑے مقالے مرتب ہوئے۔ ہر ہر گوشے کو کھنگالا گیا۔اسی ضمن میں کبھی مسلم ملکوں کے سرکاری تعلیمی نصابوں کو بدلا۔ جہادی آیات واحادیث اور جہادی واقعات نے نصابوں کو پاک کیا گیا۔ مدرسہ ڈسکورس کے ذریعے مدارس کی ٹیوننگ شروع ہوئی۔ میڈیا کو اہداف دیئے گئے۔ لہو لعب پر مبنی نشریات کو کل وقتی بنیادوں پر جاری کیا گیا۔ کبھی کھیل کود، کبھی ڈرامے و فلم، کبھی جھوٹی پروپیگنڈا مہم، کبھی نام نہاد دینی پروگرامات۔ غرض سب ایک ہی مقصد کے تحت کہ کوئی نیا موسیٰ پیدا نہ ہوسکے اور فرعون وقت کے لیے کوئی خطرہ باقی نہ بچے۔ تعلیم و ثقافت کے نام پر، کیریئر و ترقی کے عنوانات تلے ہر حربہ روبہ عمل آیا کہ موسیٰ اگر پیدا بھی ہو جائے تو جلد ہی اس کی روح ایمانی کا خاتمہ ہو جائے اور وہ معرکہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ان سب پر مستزاد عالمی دجالی نظام ہے، فرعون مصر امریکہ کی بدمعاشی کے تحفظ کے لیے عالمی اداروں کا ایک ریوڑ ہے کہ ان میں سے ہر ایک منہ لٹکائے ڈھونڈتا اور سونگھتا پھرتا ہے کہ کوئی موسیٰ کہیں انگڑائی نہ لے رہا ہو۔

الغرض بڑی محنت اور عرق ریزی سے ہمہ جہتی کام ہوا ہے۔اس تحریر میں ایسی ہی ایک کاوش کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش ہوگی تاکہ جنہوں نے موسیٰ و ابراہیم کا کردار ادا کرنا ہے وہ کچھ متنبہ ہو جائیں۔

شرل بینارڈ Cheryl benard افغان نژاد امریکی شہری زلمے خلیل زاد کی بیوی ہے۔ زلمے مختلف ادوار میں امریکی محکمۂ خارجہ میں بہت اہم مناصب پر فائز رہا ہے۔ طالبان کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں یہی امریکہ کی نمائندگی کرتا رہا ہے۔اس کی بیوی امریکہ کے بہت اہم تھینک ٹینک رینڈ کارپوریشن سے منسلک ہے۔اس کی تجاویز وسفارشات کی

روشنی میں امریکہ اپنی پالیسیاں مرتب کرتا ہے۔ شرل بینارڈ نے آج سے تقریباً بیس سال قبل مسلم امہ سے متعلق اپنی تحقیقات حکومت امریکہ کو پیش کیں۔ جو کتابی شکل میں ''سول ڈیموکریٹک اسلام'' کے نام سے شایع ہوئیں۔

موسیٰ کشی کے لیے اس خاتون نے بڑی عرق ریزی سے مسلم امہ کا مطالعہ کیا ہے۔اس مقصد کے لیے اس نے مسلمانوں کو ابتدائی طور پر چار طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ ویسے تو مسلمانوں میں مختلف طبقات پہلے سے موجود بھی ہیں۔ فرقوں، مسلکوں، خطوں اور دیگر متعدد تقسیمات موجود ہیں۔ مگر اس کتاب میں ان تقسیمات کی بجائے ایک نئی تقسیم عمل میں لانے کی کوشش کی ہے۔اس تقسیم کی اصل بنیاد ماڈرنٹی یا جدیدیت کے ساتھ تعامل ہے۔امریکہ چونکہ آج کی دنیا میں مذہب جدیدیت کا علمبردار نمبر ایک ہے اس لیے وہ اپنی پالیسیاں اسی تناظر میں ترتیب دیتا ہے۔ اس نئے مذہب سے دنیا کے تمام مذاہب نے اپنے اپنے انداز میں تعامل کیا ہے اور بڑی حد تک سارے ہی اس مذہب جدید میں جذب ہو چکے ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی مکمل دین نہیں تھا۔ اسلام ہی وہ واحد مذہب، تہذیب اور دین ہے جو اپنی کلیت اور اکملیت میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ اس لیے جدیدیت کا اصل حریف سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے ماننے والوں سے ہی تجدد کا امام امریکہ بھی خائف ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو جدیدیت میں جذب کرنے اور امریکی ایجنڈوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ امت مسلمہ کو بالکل ایک نئے اسلوب سے جانچا اور پرکھا جائے۔اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی چار بڑی اقسام بنائی ہیں۔اس تقسیم کی خصوصیت یہ ہے کہ سب سے خطرناک زمرے کو سب سے اوپر رکھا ہے۔ دوسرے زمرہ جات کو بھی اسی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ تفصیل سے پہلے ایک نظر ان زمرہ جات کے عنوانات پر ڈالیے:

فنڈامنٹلسٹ اسلام (بنیاد پرست اسلام)

ٹریڈیشنلسٹ اسلام (روایتی اسلام)

ماڈرنسٹ اسلام (جدید اسلام)

سیکولرسٹ اسلام (سیکولر اسلام)

یہ ایک ایسی تقسیم ہے جو اس سے پہلے کبھی وجود میں نہیں آئی۔ یہ خالص جدیدیت کی تخلیق یا ضرورت ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ اسلام کو اصل ہدف بنا کر اس کا ایسا تجزیہ کیا ہے کہ سب مسلمان ہمارے مخالف یا دشمن نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی دشمن ہے باقی تین کے ساتھ مختلف طریقوں سے مل کر کام کرنے کا تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ بجائے اسلام کو مورد الزام ٹھہرانے کے اسی ایک مطعون طبقے کو ہی نشانے پہ رکھا جائے اور اسلام کی کچھ ایسی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ یہ مطعون طبقہ جو اسلام کی تشریح پیش کرتا ہے وہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص ذہنیت ہے جو اسلام کی اپنی من مانی تشریحات کرتا ہے۔ گویا اسلام پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اعتراض صرف اسی ایک انتہا پسند طبقے سے ہے جسے وہ فنڈامنٹلسٹ کہتے ہیں۔ اس طبقے کو پوری طرح واضح کرنے کے بعد کتاب میں وہ تجاویز دی گئی ہیں کہ کس طرح اس طبقے کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مشکل یہ تھی کہ چونکہ یہ ایک نئی تقسیم ہے جو پہلے سے موجود نہیں ہے بلکہ مسلم معاشرہ اس طرح کی تقسیم سے ہی ناواقف ہے۔ لہٰذا کس مسلمان کو کس زمرے میں رکھا جائے۔ یہ تو اس مسلمان کو خود ہی نہیں پتہ۔

اس مشکل کو دور کرنے کے لیے کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ وہ نکات بیان کئے ہیں جن کے ذریعے یہ فیصلہ ہو سکے کہ کون کس زمرے میں آتا ہے۔ ہر نکتے کے ساتھ اس گروہ کے زمرے کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ مثلاً جمہوریت ایک نکتہ ہے اور تمام زمروں کے ہاں جمہوریت کے بارے میں موجود نظریے کو بیان کیا ہے۔ اب جس کا جو نظریہ ہے وہ خود دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کا نظریہ کس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ وہی اسکا زمرہ ہو گی۔

اسی طرح کل تقریباً دو درجن نکات کھڑے کئے ہیں جن سے زمرے کا تعین کیا جا سکے۔

ہم اس کتاب کو اس لیے سمجھنا چاہ رہے ہیں کہ اگر ہم نے جدیدیت کے شر سے اپنا دین بچانا ہے تو کیا کرنا پڑیگا۔ کس زمرے کو مضبوط کرنا ہوگا۔ اور کس کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔

اب تھوڑی سی تفصیل چاروں طبقات کی بیان کی جا رہی ہے۔ مکمل تفصیل کے لیے اصل کتاب سے استفادہ کیجئے۔

ا۔ بنیاد پرست:

کتاب کی مصنفہ کے مطابق یہ طبقہ اسلام کی انتہا پسندی پر مبنی تشریح کرتا ہے۔ ان میں رواداری نہیں ہے۔ یہ اپنے فہم اسلام کے سخت گیر اصولوں اور احکامات کو پوری دنیا پر غالب کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ تشدد اور جبر کے ہتھکنڈوں کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے اقدامات سے نہ صرف عالمی برادری بلکہ مسلمانوں کے دوسرے طبقات کو بھی شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

یہ مغرب اور بالخصوص امریکہ سے شدید دشمنی رکھتے ہیں۔ یہ جدیدیت و جمہوریت کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ جدید علوم و ٹیکنالوجی سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اس طبقے کی کسی قسم کی حمایت کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے الا یہ کہ کہیں عارضی چال کے طور پر کرنا پڑے۔

اس زمرے کو مزید دو ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلے گروہ کو scriptural فنڈامنٹلسٹ کہتے ہیں۔ یہ مذہبی ٹیکسٹ یا متون پر زور دیتے ہیں۔ اس گروہ کے مسلم دنیا میں دو نمائندے ہیں۔ ایران اور سعودی عرب۔ ایران شیعہ بنیاد پرستی کی سرپرستی کرتا ہے جبکہ سعودی عرب سنی بنیاد پرستی کی سرپرستی کرتا ہے۔ یاد رکھئے یہ ۲۰۰۳ء کی تحریر ہے۔ آج ۲۰۲۳ء میں اس میدان میں امریکہ کتنی فتوحات کر چکا

ہے اس کا اندازا سعودی ولی عہد محمد بن سلیمان کی پالیسیوں سے ہو سکتا ہے ۔ آج مملکت سعودیہ اپنی بیس سال قبل تک کی شناخت کو مکمل طور پر مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔

دوسرے گروہ کو مصنفہ نے radical فنڈ امنٹلسٹ کہا ہے۔ ان کے بارے میں مصنفہ کا خیال ہے کہ یہ طبقہ مسئلے کی اصل جڑ ہے۔ یہ ابتدا میں کسی ایک مسلم ملک میں اور بعد میں پوری دنیا میں اسلامی خلافت کو قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ دنیا کے موجودہ نظام کو بالکل ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے یہ ہر طرح کے تشدد کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ مصنفہ کا مزید یہ بھی کہنا ہے کہ یہ اسلام کی تعبیر اپنی فکر و سوچ اور vision کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ جہاں ضرورت پڑے یہ اسلام کی تعلیمات کو اپنے vision کے مطابق بدل بھی دیتے ہیں۔ یہاں مصنفہ اس طبقے پر اسلام کی اصل تعلیمات سے انحراف کا بھی الزام لگاتی ہے۔ یاد رکھئے مصنفہ کا اسلامی علم صرف آن لائن چند تحریروں تک محدود ہے جس کا خود بھی کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ بہت سے مقامات پر اسلام کی تعلیمات کو بیان کرنے میں بڑی فاش غلطیاں بھی کر جاتی ہیں۔

ریڈیکل فنڈ امنٹلسٹ مغرب اور امریکہ کے لیے اصل چیلنج ہے اور یہ پوری کتاب اس ایک گروہ کو اسلام کے دوسرے گروہوں سے الگ کرنے، اسے تنہا کرنے، مسلم ریاستوں کو اس کے خلاف اکسانے اور مغربی دنیا کو اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز رکھنے کی دعوت دیتی ہے کہ یہ جمہوریت کو کفر قرار دیتے ہیں۔ جدید طرز زندگی، آزادی، مساوات کے سرمایہ دارانہ تصوات کے دشمن ہیں۔ اس لیے ان سے نمٹنا بہت ضروری اور بہت زیادہ احتیاط کا متقاضی ہے۔

فاضل مصنفہ نے اس گروہ میں القاعدہ، افغان طالبان، حزب التحریر اور دیگر چھوٹی بڑی بہت سی تنظیموں اور جماعتوں کو شامل کیا ہے۔ جن میں ان کے مطابق قدر مشترک یہ ہے کہ یہ سب جمہوریت کو رد کرتے ہیں۔ اسلامی سزائوں کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ کثرت ازدواج کو

فروغ دیتے ہیں۔ پردے کو لازم قرار دیتے ہیں۔ خلافت اور جہاد کی دعوت دیتے ہیں۔ اپنے شدت پسند نظریات کو پھیلاتے ہیں۔

مزید کہتی ہیں کہ یہ لوگ دینی یا مذہبی تعلیمی اداروں سے باقاعدہ طور پر پڑھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ خود ہی پڑھتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں اس کو سب کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کا روایتی مسلمانوں سے بھی اختلاف ہوتا ہے۔ اس اختلاف سے مغرب کو فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس مقصد کے لیے روایتی مسلمانوں کی مدد کرنی چاہئیے امریکہ اور مغرب کو اس جانب بالخصوص توجہ مرکوز کرنی ہوگی کہ یہ طبقہ روایتی مسلمانوں کو متاثر نہ کر سکے۔ کیونکہ ان میں متاثر کرنے کی بہت صلاحیت ہے۔ یہ گروہ بہت متحرک ہیں۔ ان کا اپنے موقف کو پیش کرنے کا طریقہ بہت جاندار ہے۔ ان کے مقابلے میں روایت پسند لوگ بالعموم سادے اور سست رو ہوتے ہیں جن میں متاثر کرنے کی صلاحیت کم مگر متاثر ہونے کی صلاحیت زیادہ ہے۔

فاضل مصنفہ نے بار بار اس بات کو دہرایا ہے کہ ریڈیکل فنڈ امنٹلسٹ اسلامی متون کی پابندی کو چنداں ضروری خیال نہیں کرتے ہیں بلکہ بہت سے فیصلے یہ خود ساختہ کرتے ہیں۔

اس الزام کی حقیقت یہ ہے کہ جدید ذہن شرع کی پابندی سے آزاد رہنے کے لیے مختلف حیلے تراشتا ہے۔ ایک طرف یہ لوگ شرع کی مخصوص پابندیوں مثلا پردہ اور حدود وتعزیرات وغیرہ کو دور جدید میں ناقابل قبول یا ناقابل عمل قرار دیتے ہیں اور جب دوسرے لوگ ان پر عمل درآمد کرتے یا کرواتے ہیں تو یہ فورا کہتے ہیں کہ یہ تو شرع کا تقاضا ہی نہیں یا یہ شرع کا طریقہ نہیں ہے۔ اب یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر عمل کرنا ہی ہے تو سو فیصد طریقہ سنت والا ہو۔ مثلا کوڑے میں عین مماثلت پیدا کرو۔ اس کا میٹیریل کیا ہو۔ لمبائی چوڑائی کیا ہو۔ قتل کی سزا کے لیے بھی آلۂ قتل وہی ہو جو نبی ﷺ کے دور میں استعمال ہوا تھا۔ وغیرہ۔ اب مماثلت کی جتنی بھی کوشش کی جائے یہ اعتراض یا مطالبہ نت نئے نکات نکالتا رہے گا۔ حتی

کہ عمل سے دستبردار ہوئے بغیر کوئی راستے ہی نہیں رہے گا۔ مقصد ان کا شرع کو بااختیار بنانا نہیں بلکہ ناقابل عمل بنانا ہے۔ نتیجے میں مغرب یا ماڈرنٹی کے فیصلے آرام سے قابل قبول ہو سکیں گے۔

دوسری طرف اس ذہن کے لوگ خود بہت سے ایسے کام روز کر رہے ہوتے ہیں جس میں شرع کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع کے استعمال میں کچھ نہ کچھ ردوبدل ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ کے نبی ﷺ نے پانی سے وضو فرمایا۔ اب سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے لوٹے سے پانی لیا تھا اب ہم پائپ لائن کے آگے ٹوٹی لگا کے پانی کو استعمال کرتے ہیں۔ اب اس طرح وضو سنت کے مطابق ہوا کہ نہیں ہوا۔ ظاہر ہے یہ بڑا ہی بے تکا سا سوال ہے جسے کوئی عاقل آدمی نہیں کرے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا اس وقت ہوتا ہے جب اسلام کا کوئی حکم مغرب سے ٹکرائے۔ فوراً مغرب کو گنجائش دینے کے لیے کوئی بھی حیلہ نکال لیتے ہیں یا کوئی بھی بے تکا سوال اٹھالاتے ہیں۔

بس اسی طرح کے اعتراضات کی ایک پوری لسٹ مصنفہ نے تیار کی ہے اور مغرب اور امریکہ کو مشورہ دیا ہے کہ فنڈامنٹلسٹ کے خلاف لکھنے والوں کو مراعات دی جائیں۔ ان کی تحاریر کی اشاعت میں آسانی پیدا کی جائے۔ صحافیوں کو ان گروہوں کی مبینہ پر تشدد کاروائیوں کی رپورٹنگ اور تحقیق و تفتیش پر مامور کریں۔ ان کاروائیوں سے عام مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات کو خصوصی طور پر نمایاں کیا جائے۔ اس تمام مواد کو عامتہ الناس تک پہنچانے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر قیصر علی

نوجوان نسل میں خودکشیوں اور نشے کا بڑھتا ہوا رجحان اور اس کا حل

ایک انسان جب اپنی زندگی جیسی انمول نعمت کا خاتمہ کرتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ شدید ذہنی دباؤ کی کیفیت (Extreme state of stress) ہوتی ہے۔ شدید ذہنی دباؤ کی کیفیت سے انسان تب دوچار ہوتا ہے جب ناموافق حالات (Unfavorable conditions) کی وجہ سے پیدا شدہ پریشانی اس کی ذہنی استعداد (Mental capacity) سے اس قدر بڑھ جائے کہ اس کے حواس کو مغلوب کر دے، ورنہ عام حالات میں یہ بات ناممکن ہے کہ انسان خودکشی کرے کیونکہ فطری طور پر انسان کو اپنی زندگی محبوب اور پیاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت اپنی زندگی کی حفاظت میں لگا رہتا ہے۔ سو یہ حد سے بڑھے ہوئے ناموافق حالات ہی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان مجبور ہو کر خودکشی جیسے انتہائی اقدام پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ناموافق حالات بمقابلہ ذہنی استعداد:

دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہر انسان کو ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا مقابلہ وہ اپنی ذہنی استعداد کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اگر اس کی ذہنی استعداد اچھی ہو تو وہ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے یا تو کوئی کارگر تدبیر کر کے ناموافق حالات کو تبدیل کر لیتا ہے اور یا اگر تدبیر کارگر ثابت نہ ہو تو صبر کر کے وقت گزار لیتا ہے۔ لیکن اگر اس کی ذہنی استعداد کم ہو یا ناموافق حالات بڑھتے چلے جائیں تو وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب یہ ذہنی دباؤ کی کیفیت زیادہ عرصہ تک برقرار رہتی ہے تو اس سے انسان کے حواس متاثر ہو جاتے ہیں جس کی

وجہ سے وہ ایسے کام کرنے لگتا ہے جو معمول کے حالات میں کرنا گوارا نہیں کرتا۔ مثلاً نشہ آور اشیاء کا استعمال، اپنے آپ کو یا اہل وعیال کو نقصان پہنچانا وغیرہ۔ اور بعض اوقات یہی ذہنی دباؤ کی کیفیت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا خوشگوار اور پر سکون زندگی گزارنے کے لئے جس طرح اپنے آپ کو ناموافق حالات سے بچانا ضروری ہے اسی طرح اپنی ذہنی استعداد کو بھی اس قدر بڑھانا لازمی ہے کہ اگر ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑے تو ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔

ناموافق حالات:

ناموافق حالات کی کئی تصورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ انتہائی غربت و تنگدستی۔ ۲۔ ناکامی (امتحان، محبت، کاروبار وغیرہ میں ناکامی) ۳۔ بے عزتی کا خوف۔ ۴۔ احساس گناہ۔ ۵۔ شدت غم (کسی عزیز یا رشتہ دار کی موت) ۶۔ شدت درد (بعض بیماریوں میں انسان درد سے بے قرار ہو جاتا ہے، جو بعض اوقات خودکشی کا سبب بنتا ہے۔) ۷۔ سخت غصہ کی حالت (جیسے والدین اور بچوں کے درمیان لڑائی میں بچے والدین پر غصہ نہ نکال سکنے کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔) ۸۔ حقیقی خوشی کے حصول میں ناکامی وغیرہ۔

خودکشی کی اکثر وجوہات مندرجہ بالا حالات بنتے ہیں۔ غربت اور تنگدستی خودکشی کی وجوہات میں سرفہرست ہے۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات انسان بھوک سے لاچار ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب معاشرے میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے اور وہ وسائل جو سب پر تقسیم ہونے چاہیے تھے اپنے پاس جمع رکھتا ہے اور ان کی تقسیم زکوٰۃ اور صدقات کی صورت میں نہیں کرتا تو اس سے معاشرے میں بھوک اور افلاس پیدا ہوتا ہے اور لوگ غربت میں مبتلا ہو کر بعض اوقات خودکشی تک کر لیتے ہیں۔

اسی طرح امتحان، کاروبار یا محبت میں ناکامی اور بے عزتی کے خوف کی وجہ سے بھی بعض لوگ خودکشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شدت غم بھی خودکشی کا باعث بن سکتی ہے۔ جیسے کسی آدمی کا بچہ فوت ہو جائے جس سے اس کو بہت محبت ہو تو اس غم کی شدت کی وجہ سے بھی وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ شدت درد کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی سرطان (Cancer) کا بیمار ہے اور اس کو اتنی تکلیف ہے کہ وہ اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا تو بعض اوقات وہ اس کی وجہ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

خودکشی کا ایک سبب حقیقی خوشی کا نہ ملنا بھی ہے۔ چنانچہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ خودکشیاں سویڈن اور جاپان میں ہو رہی ہیں حالانکہ دونوں ممالک دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں سے ہیں۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مالدار اور خوشحال ممالک میں آخر کس چیز کی کمی ہے جو وہاں بسنے والوں کو خودکشی پر ابھارتی ہے؟ سو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وہ حقیقی خوشی (Real Happiness) کا نہ ملنا ہے۔ جب آدمی کے پاس کھانے پینے کے لئے خوراک، پہننے کے لئے کپڑے، رہنے کے لئے گھر اور زندگی گزارنے کے لئے باقی تمام مادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی اس کو حقیقی سکون نصیب نہیں ہوتا اور آدمی حساس (Sensitive) ہو تو وہ حقیقی خوشی پانے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ اور یہی بے چینی آخر کار اسے خودکشی کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے۔ زندگی کے ایسے موڑ پر جب کہ آدمی ترقی کرتے کرتے کامیابی کی چوٹی پر پہنچ جائے۔ خودکشی کرنے کے عام طور پر تین وجوہات ہوتے ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ جب تک انسان کی بنیادی مادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی تب تک وہ یہ سمجھتا ہے کہ حقیقی خوشی مجھے تب ملے گی جب میری ضرورتیں پوری ہو جائیں اور مجھے کسی چیز کی کمی کی فکر نہ رہے۔ لیکن جب وہ محنت و مشقت کر کے وہ تمام وسائل حاصل کر لیتا ہے

جن سے اس کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور پھر بھی اس کا دل حقیقی خوشی پانے سے محروم رہتا ہے تو وہ بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ خودکشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان چونکہ فطرتاً حریص ہے اس لئے جب تک وہ کامیابی کے زینے چڑھتا جاتا ہے تب تک کسی درجہ میں اس کے جذبہ حرص کی تسکین ہوتی ہے اور اس کی زندگی میں تنوع اور رنگارنگی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ زندگی سے اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا لیکن جب وہ کامیابیوں کے آخری زینے پر پہنچ جاتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی زندگی ایک خاص ڈگر پر چل پڑتی ہے اور تنوع و رنگارنگی کے بجائے یکسانیت آجاتی ہے تو آدمی اکتاہٹ کا شکار ہو کر زندگی سے بددل ہو جاتا ہے جس کا انجام بالآخر خودکشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب انسان اپنی زندگی کا قیمتی اور بہترین حصہ یعنی جوانی دنیا کے مال واسباب جمع کرنے میں صرف کر لیتا ہے اور پھر بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ کر ڈھلتی عمر میں سوچتا ہے کہ میں نے اتنی محنت و مشقت صرف اس لئے کی کہ چند دن ان چیزوں سے مزے لے کر مر جاؤں اور یہ سب کچھ اوروں کے واسطے رہ جائے؟۔ تو اس سے اس کا دل زندگی سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ خودکشی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ انسان صرف گوشت پوست سے بنے مادی جسم کا نام نہیں ہے کہ مادی ضرورتیں پوری ہونے کے بعد اس کو حقیقی خوشی مل جائے گی بلکہ انسان جسم اور روح سے مرکب مجموعہ کا نام ہے اور پھر جسم وروح میں بھی اہمیت روح کو حاصل ہے اس لئے انسان کی حقیقی خوشی کا تمام تر انحصار روحانی خوشی پر ہے اور روحانی خوشی درست آسمانی مذہب یعنی اسلام کے بغیر ملتی نہیں۔ سو جو لوگ اسلام کو مانتے نہیں یا مانتے تو ہیں لیکن ان کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے ان کو حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوتی جس کے باعث وہ خودکشی کا ارتکاب کر جاتے ہیں۔

ذہنی استعداد (Mental Capacity)

اگر دیکھا جائے تو عام طور پر حالات کا تغیر و تبدل انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ انسان منصوبہ بندی کرے، خوب محنت کرے اور تقدیر کا بہانہ بنا کر سستی اور کاہلی کا شکار نہ ہو لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ناموافق حالات کو مکمل طور پر ختم کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے آپ کو ذہنی دباؤ کی کیفیت سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی ذہنی استعداد کو بڑھانا ہوگا۔ ذہنی استعداد (Mental capacity) کی دو صورتیں ہیں۔

ایک طبعی ذہنی استعداد (physical mental capacity)

دوسری روحانی ذہنی استعداد (Spiritual mental capacity)

طبعی ذہنی استعداد:

طبعی ذہنی استعداد کا تعلق انسان کی صحت اور ہارمونل بیلنس (Hormonal balance) کے ساتھ ہے۔ ایک تندرست آدمی کی طبعی ذہنی استعداد ایک کمزور آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ انگریزی کا محاورہ ہے healthy body keeps healthy mind طبعی ذہنی استعداد کی کمی کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ پیدائشی کمزوری (Inborn weakness) ہے۔ بعض لوگ جسمانی لحاظ سے بہت کمزور ہوتے ہیں ان کا ہارمونل بیلنس بھی بہت کمزور ہوتا ہے۔ نفسیاتی مریضوں (Psychological patients) میں ایک کثیر تعداد اس قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ بڑی آسانی سے خودکشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگ بڑے صبر واستقامت والے ہوتے ہیں کیونکہ ان کو فطری طور پر اللہ تعالیٰ نے ایسے ہارمونل بیلنس

کے ساتھ پیدا کیا ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کے ناموافق حالات کا مقابلہ عزم وہمت کے ساتھ کرتے ہیں۔

طبعی ذہنی کمزوری کی دوسری وجہ خود اپنے ہاتھوں اپنا ہارمونل بیلنس خراب کرنا ہے، جیسے بدن کی قوت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالنا، نیند پوری نہ کرنا جس کی آج کل بڑی وجہ موبائل کا بے دریغ استعمال ہے، معمولی رنج وغم کو بھی دل ودماغ میں بسا کر ہر وقت اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنے آپ کو پریشانی اور ٹینشن مین مبتلا کرنا وغیرہ۔

ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہارمونز کا ایک بیش قیمت خزانہ دیا ہے جو کہ مختلف اوقات میں خون میں شامل ہو کر انسان کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتا ہے، جیسے اگر کسی کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس کے غدود سے بعض ہامونز خارج ہو کر اس کے خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور اسے مقابلہ کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اب اگر ایک آدمی ایسے ڈرامیں اور فلمیں دیکھتا ہو جن کی وجہ سے وہ رنج وغم اور بے چینی میں مبتلا ہوتا ہو تو وہ بے جا اپنے ہارمونز کے ذخیرے کو ضائع کرے گا جس کے نتیجہ میں اس کا جسم بھی کمزور ہوگا اور اس کی طبعی ذہنی استعداد بھی کم ہوگی۔ اور انجام کار وہ حالات کے مطابق رد عمل کے اظہار کی صلاحیت کھو بیٹھے گا۔ اس لئے اس بیش قیمت ذخیرے کی حفاظت کرنی چاہیے اور بے جا اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ کوشش کرنی چاہیے اس میں اضافہ اور بڑھوتری ہو چنانچہ اچھی اور متناسب غذاؤں اور ورزش اور میڈیا کے کنٹرول استعمال کے ذریعے اسے بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔

Hormonal balance ٹھیک نہ ہونے کا مطلب:

ہارمونل بیلنس ٹھیک نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حالات کے مطابق رد عمل نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر اس کو معمولی ناگوار بات کہہ دی جائے تو وہ غصہ سے آگ بگولہ ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ حساسیت اس کی hormonal imbalance کی وجہ

سے ہوتی ہے۔ لیکن اکثر لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ یہ ایک بیماری ہے اور اس کا میڈیکل علاج کیا جاتا ہے جس سے یہ حساسیت کم کی جاسکتی ہے۔

انسان کو اس کا دماغ کنٹرول کرتا ہے۔ انسان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس کے دماغ سے اس کے غدود کو پیغام آتا ہے اور وہ مختلف ہارمونز خارج کر کے اس کے خون میں شامل کر دیتے ہیں جس کی بدولت انسان درپیش حالت کے مطابق رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً اگر کھانے کی کوئی اچھی چیز پکی ہو اور آدمی اس کی خوشبو سونگھ لے تو اس کے منہ میں پانی آجاتا ہے کیونکہ کھانے کی خوشبو دماغ میں پہنچتی ہے اور دماغ کہتا ہے کہ لذیذ اور اچھی چیز ہے اور اس کے لیے وہ ہارمونز خارج ہو کر خون میں شامل ہو جاتے ہیں جس سے انسان کو بھوک لگتی ہے۔ سو اگر ہارمونز کا تناسب بگڑ جائے تو انسان کا رد عمل تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ حالات کا سامنا ایک عام صحت مند آدمی کی طرح نہیں کر پاتا۔

روحانی ذہنی استعداد:

ذہنی استعداد کی دوسری قسم روحانی ذہنی استعداد ہے۔ جس کا تعلق انسان کے عقیدے اور سوچ وفکر کے ساتھ ہے۔ چنانچہ جس آدمی کا عقیدہ مضبوط اور سوچ مثبت ہوتی ہے اس میں مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ایک کمزور عقیدے اور منفی سوچ والے آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک آدمی جسمانی لحاظ سے تو کمزور ہوتا ہے لیکن اس کا عقیدہ اس قدر مضبوط ہوتا ہے اور اس کی سوچ وفکر اتنی بلند ہوتی ہے کہ ناموافق حالات اس کو پریشان نہیں کرتے۔ یہاں پر عقیدے اور مذہب کا تعلق خوشگوار زندگی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ دین اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس لئے یہ انسان کو خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے ایسا عقیدہ اور سوچ وفکر دیتا ہے جس کی بدولت انسان ناموافق حالات کا مقابلہ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے اور زندگی میں کبھی بھی اسے ایسی ناموافق حالت سے واسطہ نہیں پڑتا جو اس کو

اس حد تک متاثر کر دے کہ وہ خودکشی کے لئے آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ اسلام نے ہمیں تین ایسے زبردست عقائد دیے ہیں جن کی وجہ سے مایوسی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ایک تقدیر کا عقیدہ۔

دوسرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان کہ اللہ تعالیٰ میرا خیر خواہ ہے۔

تیسرا آخرت کے اجر و ثواب کا عقیدہ۔

تقدیر پر یقین:

عام طور پر جب کوئی انسان ناکامی کا شکار ہوتا ہے تو وہ اپنی ناکامی کو ذہن میں بٹھا کر اور بار بار اس کا تصور کر کے مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ہر طرح کی تعمیری سوچ اور زندگی میں دوبارہ اٹھنے اور کامیابی کی طرف گامزن ہونے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لئے اسلام زبردست حل پیش کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۖ لِّكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَآ اٰتٰىكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ۔ (سورۃ الحدید آیت نمبر ۲۲۔۲۳)

ترجمہ: ''کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں نازل ہوتی یا تمہاری جانوں کو لاحق ہوتی ہو، مگر وہ ایک کتاب میں اس وقت سے درج ہے جب ہم نے ان جانوں کو پیدا بھی نہیں کیا تھا، یقین جانو یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ اس لیے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے، اس پر تم غم میں نہ پڑو، اور جو چیز اللہ تمہیں عطا فرمادے اس پر تم اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اتراہٹ میں مبتلا ہو، شیخی بگھارنے والا ہو۔''

جس شخص کا اس بات پر ایمان ہو کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اسی تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے، جو لوح محفوظ میں پہلے سے لکھی ہوئی ہے، تو اسے کسی ناگوار واقعے پر اتنا صدمہ نہیں ہوتا جو اسے دائمی پریشانی اور ہمیشہ کی حسرت میں مبتلا کر دے، کیونکہ اس کا عقیدہ ہی یہ ہوتا ہے

کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہی ہوا۔ اسی طرح اگر ایسے شخص کو کوئی کامیابی ملتی ہے تو وہ اس پر اترا کر تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور تقدیر کے مطابق ملی ہے، سو اس پر اترنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیے۔ کتنی دلچسپ آیت ہے کہ چونکہ یہ ناکامی اور کامیابی تمہاری تقدیر میں لکھی گئی تھی۔ اس لئے نہ تو ناکامی کی وجہ سے مایوس ہونا چاہیے اور نہ کامیابی پر غرور و تکبر اور فخر و ناز میں مبتلا ہونا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تقدیر کا عقیدہ ایک ایسا زبردست عقیدہ ہے جس کی وجہ سے آدمی انتہائی ناکامیوں اور ناموافق حالات میں بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا چنانچہ ایک برطانوی میجر آر۔ وی۔ سی بوڈلی (جس نے تقریباً سات سال شمالی افریقہ میں ایک عرب قبیلہ میں گزارے تھے) نے اپنی کتاب (Wind in sahara) میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ میں جس قبیلہ میں رہتا تھا وہ ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا اور ان کا گزر بسر بھیڑ بکریاں پالنے پر ہوتا تھا۔ ایک بار وہاں پر تیز و تند آندھی آئی جس سے آدھے بھیڑ بکریاں مر گئے۔ قبیلے والے پریشان ہوئے اور سب مل کر اپنے سردار کے پاس جمع ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں کچھ باتیں کی اور پھر سردار نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا قضاء مکتوب (یہ نقصان تو پہلے سے لکھا ہوا تھا) اور سب لوگ اٹھ گئے۔ انہوں نے کچھ بکریاں ذبح کی اور سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر حسب معمول زندگی گزارنے لگے گویا کوئی خاص بات ہوئی ہی نہیں۔ کچھ عرصہ بعد کوئی اور مصیبت پیش آئی۔ پھر سب جمع ہو گئے، آپس میں مشورہ کیا اور قضاء مکتوب (یہ نقصان تو پہلے سے لکھا ہوا تھا) کہہ کے اٹھ گئے۔ یہ میجر لکھتا ہے کہ مجھے ان لوگوں کے اس عقیدہ تقدیر نے بہت متاثر کیا کہ اس عقیدہ ہی کی بدولت وہ سخت سے سخت اور ناگوار سے ناگوار حالات کا مقابلہ بھی آسانی سے کر سکتے ہیں۔

سو جس کو تقدیر پر یقین ہو اس کی زندگی خوشگوار اور پر سکون ہوتی ہے کیونکہ کسی بھی ناکامی پر وہ کہتا ہے کہ یہ تو تقدیر میں لکھا تھا۔ لہٰذا وہ زندگی کے کسی موڑ پر مایوسی کا شکار نہیں

ہوتا۔ البتہ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں کہ کام سے جی چرائے اور سستی و کاہلی کا شکار ہو کر ناکام ہوتا رہے اور پھر ان ناکامیوں کو تقدیر کے سر ڈالتا رہے بلکہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ خوب محنت کرے، خوب کوشش کرے لیکن اگر پھر بھی ناکام ہو جائے تو یہ عقیدہ رکھے کہ یہ میری تقدیر میں لکھا تھا اور ایسا ہی ہونا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان:

پر سکوں زندگی گزارنے کے لئے دوسرا عقیدہ اللہ تعالیٰ سے ہر حالت میں نیک گمان رکھنے اور زندگی کے کسی بھی موڑ پر اللہ تعالیٰ سے ناامید اور مایوس نہ ہونے کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ میرا خیر خواہ ہے اور مجھ سے میری ماں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے وہ کسی بھی ناکامی و پریشانی میں مایوس نہیں ہوتا، ہاں اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مایوسی گناہ ہے۔ سو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایک اسباب سے مایوسی ہے مثال کے طور پر کینسر (Cancer) کا بیمار گھر میں پڑا ہے ۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ اب مزید علاج اس کے لئے کار گر نہیں ہے یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ تو ایسی صورت میں اس کی حالت سے مایوسی کفر نہیں ہے، کیونکہ اسباب کو آپ نے جتنا اختیار کرنا تھا اختیار کر لیا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا دوائی سے ٹھیک نہیں ہو گا اب دوائی اور مزید علاج سے مایوس ہونا کفر نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے مایوسی نہیں ہے بلکہ اسباب سے مایوسی ہے کہ اب اسباب کو اختیار کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا انکار کہ اس مریض کو اللہ تعالیٰ اس حالت میں شفاء نہیں دے سکتا، یہ وہ مایوسی ہے جو حرام ہے، ایسی صورت میں بھی یہ پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو شفاء دے سکتا ہے اور اگر تقدیر میں اس بیماری سے اس کی موت لکھی ہے تو موت میں ہی اس کے لیے خیر ہو گی۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۱۶)

ترجمہ: ''یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔''

زندگی میں آئے روز ایسے واقعات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک بچہ کسی امتحان میں ناکام ہوتا ہے اور لوگ اس کے بارے میں افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ انجنیئرنگ یا میڈیکل میں نہیں جا سکا۔ پھر مجبوراً اس کو کسی اور شعبے (field) میں ڈال دیتے ہیں۔ اور انجام کار وہ اسی شعبے میں ایسا کارنامہ کر لیتا ہے کہ لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔ اب اگر وہ ناکام نہ ہوتا تو کبھی بھی وہ کارنامہ نہ کر سکتا۔ اسی طرح کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو یونیورسٹی میں فیل ہو گئے لیکن فیل ہونے کے بعد جب انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا تو بہت بڑے تاجر بن گئے۔ اگر وہ ناکام نہ ہوتے تو کبھی بھی تاجر نہ بن سکتے۔

بہر حال ان تمام تر باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمیشہ نیک گمان رکھنا چاہیے۔ اور تقدیر پکا یقین رکھنا چاہیے کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا یا مستقبل میں ہو گا یہ سب میری قسمت میں لکھا ہے اور اسی میں میرے لیے خیر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ میرا خیر خواہ ہے اور وہ مجھ پر مہربان ہے۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خیر خواہ ہے اور ہم پر بے حد مہربان ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک جنگ میں قیدی آپ ﷺ کے پاس لائے گئے ان میں ایک عورت بھی تھی جو اپنے بچے کی تلاش میں دوڑ رہی تھی اچانک اس نے اپنے بچے کو دیکھا تو اسے جلدی سے اٹھایا اور شدت محبت میں اسے سینے سے لگایا اور اسے دودھ پلایا۔ آپ ﷺ نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا کہ آپ لوگ کیا کہتے ہیں کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ سب نے کہا کہ اللہ کی قسم کبھی نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ عورت جس قدر اپنے بچے پر مہربان ہے اس سے زیادہ اللہ

تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔(بخاری شریف حدیث ۵۹۹۹)

آخرت کا اجر و ثواب:

اسی طرح ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے یہ عقیدہ بھی دل میں پختہ کرنا چاہیے کہ دنیا میں ہمیں جو بھی تکلیف و مصیبت پہنچتی ہے اس پر اللہ تعالیٰ آخرت میں ہمیں اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو تکلیف و مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو اس مصیبت کو اس کی گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ مسلمان کو دنیا میں جو بھی کوئی غم یا تکلیف یا بیماری یا فکر لاحق ہوتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔(بخاری شریف حدیث نمبر ۵۶۴۲)

اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی مَنْ **يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ** (یعنی جو کوئی کچھ برائی کرے گا اس کی اسے سزا دی جائے گی)، تو ہم سخت رنج و غم اور فکر میں پڑ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اس آیت نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، ذرا سی برائی بھی ہو گی تو اس کی سزا ملے گی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ فکر میں نہ پڑو اپنی طاقت و قدرت کے مطابق عمل کرتے رہو، کیونکہ (جس سزا کا یہاں ذکر ہے ضروری نہیں کہ وہ جہنم ہی کی سزا ہو بلکہ) تمہیں دنیا میں جو بھی کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ اور برائی کی سزا ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو وہ بھی گناہ کا کفارہ ہے۔(مسلم شریف حدیث نمبر ۲۵۷۴)

حضرت صدیق اکبر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب یہ آیت **مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ** ان کو سنائی تو ان پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو رسول کریم ﷺ نے یہ اثر دیکھ کر فرمایا کیا بات ہے؟ تو صدیق اکبر نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی برائی نہیں کی اور جب ہر برائی کی جزا ملنی ہے تو ہم میں سے کون بچے گا؟ آپ نے فرمایا اے ابو بکر! آپ اور آپ کے مؤمن بھائی کوئی فکر نہ کریں، کیونکہ دنیا کی تکالیف

کے ذریعہ آپ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو کوئی مصیبت اور غم نہیں پہونچتا؟ صدیق اکبر نے عرض کیا بیشک سب چیزیں پہنچتی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بس یہی جزاء ہے تمہاری لغزشوں کی۔(مسند احمد حدیث نمبر ۷۰)

اور حضرت عائشہ صدیقہ کی ایک حدیث میں ہے کہ بندہ کو بخار یا تکلیف پہونچتی ہے یا کانٹا لگتا ہے تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک حب میں تلاش کرے مگر دوسری حب میں ملے، اتنی مشقت بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔(مسلم شریف ۲۵۷۲)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حب مسلمان اتنی دیر کے لئے پریشان ہو جائے کہ دائیں حب میں کوئی چیز رکھی ہو اور یہ بھول کر بائیں حب میں اس کو تلاش کرے تو اتنی تھوڑی سی پریشانی پر بھی اس کو ثواب ملتا ہے۔ تو اگر کوئی سخت مصیبت اور بیماری میں مبتلا ہو جائے تو کیا اس کو صبر کا ثواب نہیں ملے گا؟ یقینا ملے گا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اعمال تولے گا تو اس میں صرف نماز اور روزے کا ثواب نہیں ہو گا بلکہ اس میں ایک اچھا خاصا حصہ دنیا میں تکالیف پر صبر کرنے کا بھی ہو گا۔ جب بندے کے صبر کو میزان کے پلڑے میں ڈالا جائے گا تو گناہوں کا پلڑا اُٹھ جائے گا اور نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو کر جھک جائے گا۔ اس وقت انسان کہے گا کہ کاش مجھ پر دنیا میں اور زیادہ مصیبتیں آتی تاکہ آج مجھے اس کا بدلہ ملتا۔

ہمارے دین میں ہمارے پاس آخرت کی جزا و سزا کی صورت میں ایک ایسا عقیدہ موجود ہے جو کسی بھی موڑ پر انسان کو مایوس ہونے نہیں دیتا۔ اگر عالم آخرت کا تصور زندگی سے نکل جائے تو یہ زندگی جنگل کا نمونہ بن جائے گی۔ عالم آخرت کے عقیدے سے انسان کو بہت سکون ملتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی غریب آدمی سے آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غریب پیدا کیا ہے آپ صبر کریں، آخرت میں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ تو وہ مطمئن ہو جاتا

ہے اور اسے تسلی مل جاتی ہے اور اس عقیدے کی بدولت غربت کے باوجود اس کی زندگی سکون واطمینان کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا عالم آخرت کا وجود انسانوں کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے دین اسلام کو صرف عبادات میں محصور کر دیا ہے اور زندگی کے باقی شعبوں میں اس کے زریں اصولوں کو پس پشت ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے دین دار اور عبادت گزار لوگ بھی ناگوار اور ناموافق حالات میں اس طرح پریشانی، بے چینی اور ٹینشن کا شکار ہو جاتے ہیں جس طرح دین پر عمل نہ کرنے والا آدمی پریشانی کا شکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی دین دار آدمی کا کوئی عزیز فوت ہو جائے تو وہ بھی پریشانی اور بے چینی کی کیفیت سے مغلوب ہو کر وہ ساری باتیں زبان پر لاتا ہے جو کوئی بے دین آدمی ہی ایسے موقع پر کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دین دار آدمی کسی ناکامی کا شکار ہو جائے تو اس کی حالت بھی کسی دین سے دور یا دین بے زار آدمی کی مانند ہوتی ہے۔ سو ناموافق حالات کا مقابلہ نہ کر سکنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دین دار آدمی کے پاس دین کے اعمال تو ہوتے ہیں لیکن دین کا درست تصور (concept) نہیں ہوتا۔ جب ہم دین اسلام کا نظریہ اپنائیں گے اور اس کا درست تصور ہمیں نصیب ہو گا تو اس سے ہماری روحانی ذہنی استعداد بڑھے گی اور ناموافق حالات کا مقابلہ کرنا آسان ہو گا۔

روحانی ذہنی استعداد بڑھانے کا ذریعہ۔ تصوف:

روحانی استعداد بڑھانے کے لئے دین اسلام میں اخلاقیات کا ایک مستقل نظام ہے جس میں صوفیاء دل پر محنت کر کے اس سے برے اوصاف جیسے ریاکاری، تکبر، عجب، دنیا کی محبت، حسد، بغض وغیرہ کو نکال کر اچھے اوصاف جیسے اخلاص، تواضع، عاجزی، فکر آخرت، اور دوسروں کے لئے خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو جذباتی طور پر ذہین (Emotionally Intelligent) بنانے کے لیے کام کرتے ہیں کیونکہ

جب انسان Emotionally Intelligent بن جاتا ہے تو پورا معاشرہ اس سے فائدہ لیتا ہے۔ چنانچہ تصوف کا مقصد خوشگوار اور مفید شخصیات کا پیدا کرنا ہے۔ جن سے معاشرے کو فائدہ بھی پہنچے اور جو معاشرے کے لیے خوشگوار بھی ہوں، بعض اوقات آدمی مفید تو ہوتا ہے لیکن خوشگوار نہیں ہوتا۔ لوگوں کو طرح طرح سے پریشان کرتا ہے جبکہ بعض اوقات آدمی خوشگوار ہوتا ہے لیکن مفید نہیں ہوتا، جبکہ دونوں باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ مفید اور خوشگوار شخصیت کی نہ صرف اپنی زندگی چین، سکون اور امن واطمینان کا گہوارہ ہوتی ہے بلکہ وہ دوسروں کے لئے بھی رحمت کا باعث ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے امریکہ کی Stanford university میں اس بات پر ایک دلچسپ تحقیق (research) کی گئی کہ آیا انسان کی کامیابی کا تمام تر انحصار صرف اس کے IQ لیول اور ذہانت پر ہے یا اس سے علاوہ بھی بعض ایسے اوصاف اور خوبیاں ہیں جن کی بدولت آدمی ترقی کے زینے طے کرتا ہوا کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس تحقیق کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے مشاہدہ کیا کہ معاشرے میں بہت سے انتہائی ذہین لوگ بھی بعض اوقات ناکام ہو جاتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں بعض اوسط درجہ ذہین لوگ آگے نکل جاتے ہیں۔ جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے صرف intelligence quotient کا زیادہ ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور اسباب بھی ہیں جو ذہانت کے ساتھ مل کر انسان کو کامیاب بناتے ہیں۔ چنانچہ ان اسباب کا کھوج لگانے کے لئے انہوں نے تحقیق شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے مختلف اسکولوں سے بچوں کو منتخب کیا اور پھر ایک طویل مدت تک ان پر تحقیق جاری رکھی۔ اس عرصہ میں وہ ان بچوں کو مختلف امتحانات اور آزمائشوں سے گزار کر اُن کا Intelligence Quotient بھی دیکھتے تھے اور ساتھ ساتھ ان کے جذبات کا جائزہ بھی لیتے تھے کہ وہ مختلف موقعوں پر کس قسم کے رد عمل (response) کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً وہ بچوں کے سامنے چاکلیٹ رکھ کر کہتے کہ

جو بچہ ابھی چاکلیٹ لے گا اسے صرف ایک چاکلیٹ ملے گا اور جو بچہ دس منٹ انتظار کر کے لے گا اسے دو چاکلیٹ ملیں گے۔ چنانچہ وہ دیکھتے تھے کہ بعض بچے تو اسی وقت اپنی چاکلیٹ لے کر کھا جاتے جبکہ بعض بچے آرام سے بیٹھے انتظار کرتے رہتے۔

اسی طرح جب انہیں کھیل کے لئے لے کر جاتے تو وہ دیکھتے کہ بعض بچے دوڑ کر جاتے جبکہ بعض دیگر بچے آرام اور سنجیدگی کے ساتھ جا رہے ہوتے۔ اسی طرح کھانے کے دوران انہوں نے مشاہدہ کیا کہ بعض بچے اپنی باری کا انتظار کئے بغیر کھانے پر جھپٹ پڑتے جبکہ بعض بچے وقار کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتے اور سلیقے سے کھانا کھاتے۔ اس طرح وہ ان بچوں کو مختلف مواقع پر دیکھتے رہے۔ اور ان کو مختلف امتحانوں میں ڈالتے رہے آخر کار انہوں نے چالیس سال کے بعد اس تحقیق کے نتائج شائع کئے جس میں انہوں نے لکھا کہ۔

Only IQ is not sufficient for success, people with average IQ but with good emotional intelligence were the real people who succeeded in life.

یعنی کامیابی کے لئے صرف بلند IQ کا ہونا کافی نہیں ہے، کیونکہ زندگی میں حقیقی طور پر کامیاب ہونے والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو متوسط درجہ IQ کے حامل ہوتے ہیں لیکن وہ جذباتی طور پر ذہین ہوتے ہیں۔

اسے ایک مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی بڑا ذہین و فطین، لائق و فائق اور اپنے کام کا ماہر ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ سخت گیر، سخت مزاج، جھگڑالو، متکبر اور اپنے سوا ہر ایک کو نالائق اور حقیر سمجھنے والا ہو یہاں تک کہ اپنے افسر سے بھی سیدھی منہ بات نہ کرتا ہو۔ ایسے شخص کا دفتر میں کیا مقام ہوتا ہے؟ کیا ذہانت کے باوجود لوگ اس سے پریشان اور تنگ نہیں ہوتے؟۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں دفتر کے پورے عملہ کی یہ دلی خواہش نہیں ہوتی کہ کس طرح وہ کہیں اور ٹرانسفر ہو جائے اور ان کی جان چھوٹ جائے؟۔ حالانکہ جب وہ

دفتری کام بھی پورا کرتا ہے اور لائق و فائق بھی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ سارا عملہ اس سے تنگ اور اس کے چلے جانے کا خواہش مند ہوتا ہے؟ صرف یہی ایک وجہ ہے کہ وہ اپنے کام کے اعتبار سے مفید تو ہے لیکن اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے خوشگوار نہیں ہے۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ کامیاب ہونے کے لئے صرف مفید ہونا کافی نہیں ہے بلکہ مفید ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگوار ہونا بھی انتہائی ضروری و لازمی امر ہے یعنی صرف فطری ذہانت و فطانت اور اپنے پیشہ وارانہ کام میں مہارت کامیاب ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق و کردار کے حوالہ سے اعلیٰ اخلاق جیسے خیر خواہی، ہمدردی، خلوص، تواضع، عاجزی اور خدمت خلق جیسے اوصاف کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح بعض لوگ دین داری کے آڑ میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں۔ جب دیندار بنتے ہیں اور داڑھی رکھتے ہیں تو پھر ہر ایک کو دین کے حوالہ سے طنز و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو دین دار اور بڑا سمجھ کر لوگوں کو بے دینی اور نفاق کا طعنہ دیتے نہیں تھکتے۔ اور جب ایسے شخص سے کہا جاتا ہے کہ دوسروں کو طعنہ دینا برا عمل ہے تو وہ بہت ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں منافق نہیں ہوں میں منہ پر بات کرتا ہوں۔ حالانکہ کسی مسلمان کو ایذا دینا اور منہ پر بات کر کے اس کو تکلیف دینا یہ غیبت سے زیادہ شدید ترین گناہ ہے۔ ایسے لوگوں جذباتی ہوتے ہیں، ان میں ذہانت بہت کم ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ معاشرے اور اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے ناخوشگوار اور ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ ہر آدمی ان سے چھڑتا اور انہیں دیکھ کر راہ بدلتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ معاشرے میں تعمیری کام کرنے کے لئے آدمی کو مفید و خوشگوار ہونا چاہیے۔ اور تصوف میں یہی کیا جاتا ہے کہ دل پر محنت کر کے اس سے ان برے اوصاف (کبر، حسد، غصہ، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا وغیرہ) کو نکالا جاتا ہے جن کی وجہ سے آدمی معاشرے کے لئے ناخوشگوار بنتا ہے اور ایسے اچھے اوصاف تواضع، عاجزی دوسروں کے لئے

خیر خواہی، ہمدردی اور جذبہ خدمت وغیرہ) کو پیدا کیا جاتا ہے جن کی بدولت آدمی سب کے لئے خوشگوار بنتا ہے۔

خلاصہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہونے کے لئے ہمیں اپنے آپ پر توجہ دینی چاہیے۔ اپنی ذہنی استعداد کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے، چونکہ ذہنی استعداد بڑھانے میں بڑا کردار ہارمونز کے توازن کا بھی ہوتا ہے اس لئے اپنے ہارمونل بیلنس کی حفاظت کرنی چاہیے جس کے لئے موبائل کا کنٹرول استعمال انتہائی ضروری ہے۔ موبائل پر غیر ضروری اشیاء دیکھنے سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے اور اپنے وقت کو قیمتی بنا کر کسی جائز دنیاوی یا دینی کام میں صرف کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہنی استعداد میں اضافہ کے لئے اپنی سوچ و فکر اور اعمال واخلاق و کردار کی اصلاح پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، جس کے لئے اپنے ماحول کو ٹھیک کرنا یعنی اچھے اور دیندار دوستوں کی صحبت اختیار کرنا اور برے دوستوں سے اپنے آپ کو بچانا انتہائی ضروری ہے۔ اسی طرح ان چیزوں کا جائزہ لینا چاہیے جو ہم سنتے، دیکھتے یا پڑھتے ہوں، کیونکہ انسان سننے اور دیکھنے سے اثر لیتا ہے۔ لہٰذا اپنے سننے اور دیکھنے کو دین کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔ اور کسی اللہ والے سے اپنا تعلق بنا کر اپنی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنا چاہیے۔ اس سے ان شاءاللہ تعالیٰ ہماری دنیاوی زندگی میں بھی خوشگوار تبدیلی آئے گی اور ہماری آخرت بھی سنور جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (بشکریہ سہ ماہی ''البیان'' پشاور)

محمد موسیٰ بھٹو

مسلمانوں کو درپیش مسائل

اور اسلامی اعتبار سے ان کا حل

عالم اسلام کی بے بسی کا منظر

اس وقت دنیا کا ہر مسلمان بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنا ہوا ہے، وہ شدید تشویش میں مبتلا ہے کہ معلوم نہیں، اس کے ساتھ اور اس کے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے، اور وہ کس آفت سے دوچار ہونے والے ہیں، مسلمانوں کی بے بسی کی یہ حالت ایسی ہے، جس سے دل خون کے آنسو رو رہا ہے، اس بے بسی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی سے محرومی کی وجہ سے مسلمان جدید طاقتور ٹیکنالوجی کی حامل قوتوں کے سامنے بے بس ہیں۔

وہ طاقتیں جس طرح چاہتی ہیں انہیں مرعوب اور خوف زدہ کر کے، ان سے اپنے مقاصد حاصل کر لیتی، مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کردار کی رونق سے بھی محروم ہے، ٹیکنالوجی سے محرومی کے ساتھ کردار دسے بھی محروم ہونا، یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے عالمی قوت کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب نکال دیا ہے، وہ انہیں ہر طرح سے پامال کر رہی ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے خوف زدہ کرنا، یہ اتنا بڑا ہتھیار ہے جو عسکری قوت سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔

مسلمان یہ دیکھکر حیران ہو کہ ان کے وسائل ان کے وسائل نہیں رہے، ان کی ریاستی پالیسیاں ان کی نہ رہیں، وہ شدید مہنگائی کا شکار ہیں عالمی قوت عسکری اور فوجی قوت کے بجائے جدید طاقتور ٹیکنالوجی کے ذریعہ مسلمانوں سے یہ سارے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔

یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے، مسلمانوں کو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ ان حالات میں کیا کریں، جس سے ان کے تحفظ کی صورت پیدا ہو اور وہ جدید مادی قوتوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں، ٹیکنالوجی کی قوت حاصل کرنے کا وقت تو ضایع ہو چکا، ان حالات سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مسلمان اپنی بے بسی کی فریاد اللہ سے کریں، اللہ سے مدد مانگیں اور اپنے اعمال کو درست کر کے اللہ کی ذات کو اپنے لئے واحد سہارا بنائیں، اللہ کی ذات بہت بڑی ہے اور وہ کریم ذات بھی ہے، اگر مسلمان اخلاص کے ساتھ اپنے اعمال بد کی اللہ سے معافی مانگیں اور اس کی طرف رجوع ہوں تو حالات کا رخ پلٹ سکتا ہے اور اس وقت خوف زدگی کی جو حالت مسلمانوں پر طاری ہے، وہ اس حالت سے نکل جائیں اور عالمی قوت خود خوف زدگی کا شکار ہو، یہ تبھی ہو سکتا ہے، جب مسلمان اپنے اعمال میں سدھار کی صورت پیدا کریں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔

خوف زدگی ایک نفسیاتی حالت ہے، مسلمانوں کو اس نفسیاتی حالت سے نکل کر اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنی ہو گی کہ اللہ کی ذات ہمارے ساتھ ہے تو مادی قوت ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے، لیکن یہ خود اعتمادی ایمان کی حالت کو مستحکم کئے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

عالم اسلام کی بے بسی کا یہ منظر کوئی ایک دن میں پیدا نہیں ہوا، بلکہ یہ عرصے سے ان کی غفلتوں کا نتیجہ ہے، انہوں نے اپنے مادی وسائل بڑی بڑی عمارتوں، عیش و عشرت اور فضول

خرچی میں تو صرف کئے، لیکن ٹیکنالوجی کے حصول کے طور پر اپنے آپ کو مستحکم کرنے سے غفلت برتی، انہیں ہوش ہی نہیں رہا کہ اہل کفر انہیں لقمہ تر بنانے کے لئے کوشاں ہیں اور اس کی تاک میں ہیں، نیز مسلمان ہونا، ان کی نظر میں اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا پامال کرنا ہے، قدرت نے انہیں صحیح معنٰی میں مسلمان بننے کے بہت سارے مواقع دیئے، لیکن یہ سارے مواقع ضایع کر دیئے، یہ غفلت بھی ہے تو عیش و عشرت کا مزاج بھی ہے، اس کی سزا پوری ملت کو مل رہی ہے کہ وہ آج بے بسی کی تصویر بن چکی ہے، ماضی سے سبق سیکھ کر اگر مسلمان حکمران اب بھی بیدار ہوں اور امت کو ساتھ لے کر خدا پرستی اور خود اعتمادی کی راہ پر گامزن ہوں تو وہ مادہ پرست دنیا کی مزاحمت کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اسلام کی سعادت سے بھی بہرہ ور کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ اللہ سے دوری کی سزا صرف آخرت میں ہی نہیں بھگتنی ہو گی، بلکہ اس کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے، اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے اور ان کے احکامات پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور اپنی خود ارادی اور خود مختاری سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، یہ سزا کوئی معمولی سزا نہیں ہے، سمجھنے والوں کے لئے بڑی سزا ہے۔

اللہ کی مخلصانہ اطاعت کی یہ خاصیت ہے کہ غیروں کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے، اگر وہ غلطی سے ایسا کرتے ہیں تو انہیں خود اس کی سزا بھگتنی ہوتی ہے۔

اللہ کی مخلصانہ اطاعت ملت کی بے بسی کی حالت کو ختم کر کے ان کو سرفرازی عطا کرتی ہے، اب یہ ملت کا کام ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کے مطابق زندگی گزار کر خود رائی اور خود مختاری چاہتی ہے یا غیروں کی بالادستی۔

ملت کو ان دونوں میں سے ایک ہی راہ اختیار پڑے گی۔

قومی وسائل کو عسکری اور ٹیکنالوجی کے حصول کے طور پر مستحکم کرنے کے لئے استعمال کریں، مقتدر طبقات کے اسراف یعنی عیش و عشرت پر وسائل صرف کرنے پر پابندی عائد کریں، اپنی نسلوں کی تربیت میں نظریاتی پختگی اور ایمان ویقین کے استحکام کا خصوصی اہتمام کریں۔

مسلم ممالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی جملہ ضروریات کے بارے میں خود کفیل ہوں، دوسروں کی محتاجی سے بچیں، افراد کے بجائے اداروں کو مضبوط کریں، ملت کی وحدت کو پیش نظر رکھیں، مسلمان کی حیثیت سے کمزور مسلم ممالک کی خوب مدد کریں، جو مسلمان ممالک عالمی مالیاتی اداروں کے مقروض ہیں، ان کا قرضہ اتاریں، یہ اسلامی برادری کی حیثیت سے ان کا اخلاقی فریضہ ہے، اہل کفر سے کسی بھی صورت میں خوف زدہ نہ ہوں، ہر معاملے میں اپنی عوام کو ساتھ لے کر چلیں، اور مسلم معاشرہ کی دینی اعتبار سے تربیت کا بہتر سے بہتر اہتمام۔ عالم اسلام کا اصل کام تو یہ تھا کہ وہ اہل کفر تک اسلام کی دعوت پہنچائیں، تاکہ ان کے لئے آخرت کے دائمی عذاب سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے کردار کی روشنی کے ساتھ ساتھ اہل کفر کے مراکز میں علمی اداروں کو مستحکم کرنا چاہئے تھا، لیکن یہی وہ کام ہے جو نہیں ہو رہا ہے، شاید اس کی سزا ہے کہ اہل کفر عالم اسلام کو اپنے زیر نگیں رکھنے میں کامیاب ہوا ہے اور عالم کفر زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ تمہارے پاس توحید خالص کی جو پاکیزہ تعلیمات موجود ہے، وہ تم نے ہم تک نہیں پہنچائی اور ہمیں دائمی عذاب سے دوچار کر دیا، تم اس کی سزا بھگتو کہ دنیا میں تمہاری باگ ہمارے حوالے ہے، تم ہر معاملے میں ہمارے محتاج ہو۔

عالم اسلام اگر ایمان سے محروم دنیا کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرے تو نہ صرف یہ کہ ان پر عالمی طاقت کی خوف زدگی کی فضا ختم کر دی جائے گی، بلکہ ان کو مزید نعمتوں سے نوازا جائے گا اور دنیا میں طاقت کا جو توازن اہل کفر کے حق میں ہو گیا ہے، وہ توازن ختم ہو کر مسلمانوں کے لئے نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہو جائے گا۔

اللہ کا وعدہ برحق ہے **(وانتم الاعلون ان کنتم مومنین)** اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرنا ہے، مومنوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ غیروں تک حق وصداقت کا پیغام پہنچائیں اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرائیں، ہم نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ محض وعظ ونصیحت نہیں ہے، بلکہ اصولوں پر مشتمل چیزیں ہیں۔

امت مسلمہ کی حالت زار

اس وقت مسلم امت کے حالات اچھے نہیں ہیں، لگ بھگ، امت کا ہر فرد پریشان ہے، امت کی حالت زار کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو کچھ اسباب اس طرح ہیں، • قیادت کا بحران ہے، جس نے امت کو دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، ہر جگہ بادشاہت اور آمریتیں مسلط ہیں، ان آمریتوں کو امت کے مسائل کے بجائے اپنے اقتدار اور مفادات سے ہی دلچسپی ہے، اس کے علاوہ کوئی فکر لاحق نہیں۔

یہ قیادت عالمی سطح پر عالمی شاہوکار کے زیر دست ہے، قیادت کے بحران نے امت کو عالمی کفر کے لئے لقمہ تر بنادیا ہے۔

مادیت کی عالمگیر فضا نے امت سے وابستہ افراد کو ذہنی طور پر اسلام پر یقین کی حالت کو کمزور کر دیا ہے اور عملی طور پر دنیاداری کی راہ پر گامزن کر دیا ہے •امت میں اسلامی تحریکیں اور علمائے کرام موجود ہیں جو اپنی حد تک احیائے اسلام کے لئے کام کر رہی ہیں، لیکن مادیت کا سیلاب اتنا بڑا اور طاقتور ہے کہ افراد امت کو اس سیلاب سے بچانے کی کاوشیں کم ہی نتیجہ خیز ہیں، اس لئے کہ ریاست کی قوت ان کے ہمنوا نہیں۔

اہل کفر کے ساتھ وسائل کی بہتات بھی ہے، جدید میڈیا کے طاقتور آلات بھی تو طاقتور تنظیم بھی۔ جب کہ امت مسلمہ کو مادیت کے سیلاب سے بچانے والے مصلحین اس اعتبار سے کمزوری کا شکار ہیں، بالکل وہ حالت ہو گئی ہے جو ایک حدیث شریف میں بیان ہوئی ہے کہ اسلام کی شروعات غربت (یعنی اجنبی حالت) میں ہوئی اور آخر میں پھر اسلام حالت غربت یعنی اجنبی ہو جائے گا، آپ نے مزید فرمایا غریبوں کے لئے خوشخبری ہو۔

اس حدیث شریف میں آخری دور میں اہل اسلام کی حالت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اس سے بہتر نقشہ کھینچا ہی نہیں جا سکتا۔ اسلام سے وابستہ افراد یا اسلامی دعوت کا کام کرنے والے

صاحبان جو اکثر غرباہی کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری سنائی ہے کہ یہ سعادت عظمیٰ انہی کے حصہ میں آئی ہے کہ وہ آخری دور میں ہر اعتبار سے تہی دستی کے باوجود اسلام پر عمل پیرا بھی ہیں تو ساتھ ساتھ اس کی دعوت کے کام کے لئے کوشاں بھی۔

ایک حدیث شریف میں امت سے وابستہ افراد کی مثال جسم سے دی گئی ہے کہ جسم کے جس حصہ کو بھی تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم اس کی اذیت محسوس کرتا ہے، دوسری حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جسے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے، یا مسلمانوں کی فکرمندی نہیں ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں وقفہ کے ساتھ ایسی شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جو اہل اسلام میں بیداری کی تحریک پیدا کر کے، ان کے زوال کو دور کرنے اور ان کے لئے رجوع اللہ کا ذریعہ بنتی رہی ہیں، لیکن موجودہ دور میں اس طرح شخصیت بھی ظاہر نہیں ہو رہی ہے حالانکہ اہل اسلام کا موجودہ دور جیسا زوال اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ امید کی جارہی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی امام مہدی کا ظہور ہو گا جو مسلمانوں کو منظم کر کے جذبہ جہاد کے ذریعہ وہ ان میں نئی روح پھونکنے کا باعث بنے گا، اس طرح مسلمانوں پر اہل کفر کے زور ٹوٹنے کی سبیل پیدا ہو گی۔

محمد موسیٰ بھٹو

قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں
نظام تعلیم کا کردار

قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں تعلیم کا کردار سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے، تعلیم میں اگر خداپرستی پر مبنی نظریہ کی روح شامل ہو، تو اس طرح کی تعلیم سے خدا سے محبت کرنے والے افراد پیدا ہوتے ہیں، جو قومی اور ملی زندگی کے ہر شعبے کی تعمیر و تشکیل میں اس نظریے کے تقاضوں کو شامل کرتے ہیں، اس طرح کی تعلیم سے ایسے اہل سیاست ایسے آفسران اور ایسے اہل تجارت وغیرہ تیار ہوتے ہیں، جو اللہ کی محبت کے زیر اثر اپنے مفادات سے دستبردار ہو کر، ملت کی تعمیر کا کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، ایسی تعلیم قوموں کے لئے سرمایہ حیات ہوتی ہے اور انہیں بلند کرنے کا ذریعہ بھی۔ لیکن اس تعلیم کا تقاضہ اسلامیت کے ایک آدھ کتاب کے شامل ہونے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ سارے نصاب تعلیم کو اللہ کی شان عظمت سے سرشار کرنے سے وابستہ ہوتا ہے، چونکہ اللہ قادر مطلق ہستی ہے۔ ساری کائنات کی خالق ہستی ہے، ساری اشیائے کائنات اس کی تعریف و تسبیح کرتی ہے، سارے علوم اسی کے پیدا کردہ ہیں، اس لئے نصاب تعلیم میں اس کی روح کو شامل کرنے سے ایسے افراد تیار ہوتے ہیں، جو اللہ اور اس کے بندوں سے وفاداری کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں، وہ صاحب کردار ہوتے ہیں، اللہ کی محبت ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نمایاں ہوتی ہے، وہ اللہ کی مخلوق کی بھلائی اور ان کے مفاد کو اپنا مفاد سمجھتے ہیں۔

اس طرح کے نظام تعلیم ہی سے قومیں ہر طرح کے بحرانوں سے بچ جاتی ہیں۔

سارے علوم وفنون کی اصل آکر جہاں پہنچتی ہے، وہ اللہ کی وحدانیت ہے، یعنی سارے علوم وفنون اللہ کی وحدانیت کے مظہر ہیں، ان علوم کی ساخت میں اپنے خالق کی معرفت اور اس کی روح موجود ہے، اس لئے ان علوم کو جب اللہ کی وحدانیت کے مرکزی نکتے کے تحت پڑھا جائے گا تو اس سے اللہ کی شان عظمت کے زیر اثر اللہ کی محبت پیدا ہو گی اور اللہ کی محبت فرد کو ساری زندگی اللہ کی اطاعت کے دائرے میں رکھے گی اور اطاعت کے دائرے سے باہر جانے نہیں دے گی۔

علوم کا حاصل اللہ کی شان عظمت کا غلبہ ہے، اور اس کا نتیجے اللہ سے والہانہ محبت ہے۔

تعلیم کا دوسرا نظام عقلیت پرستی اور مادیت پرستی پر مبنی ہوتا ہے یا مادیت پرستی پر مبنی نظریات سے ماخوذ ہوتا ہے، اگر مسلمان اپنے پاکیزہ نظرئے سے اعراض کر کے اس طرح کے نظام تعلیم کو اپنا حصہ بناتے ہیں تو اس سے اسلام اور اسلامیت کی روح سے بے بہرہ اہل سیاست، افسران اور اہل تجارت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، جو اپنے مفادات اور حرص وہوس کے جذبات کی وجہ سے قومی وملی زندگی کو زیر وزبر کرنے اور اپنے کردار سے انہیں نئے نئے بحرانوں سے دوچار کرنے کا باعث بنتے ہیں، اس طرح کا نظام تعلیم دل اور روح کو فاسد بنانے کا ''کارنامہ'' سرانجام دیتا ہے، ایسی قوم کا نظام تعلیم ہی ان کے زوال اور پستی کے لئے کافی ہوتا ہے۔

تعلیمی نظام اگر اسلامی نظرئے سے ہمہ آہنگ نہ ہو تو اس سے جو نقصانات ہوتے ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں۔

• قومی وحدت کا عمل متاثر ہوتا ہے • لسانی اور علاقائی قومیتوں کو سر اٹھانے کا موقعہ ملتا ہے • اقتدار کی جنگ تیز ہوتی ہے • مختلف طبقات میں رسہ کشی کی حالت شروع ہو جاتی ہے •

مقتدر طبقات کا غلبہ ہونے لگتا ہے• ہر لسانی وعلاقائی قومیت اپنے ساتھ ظلم وزیادتی کا رونا رونے لگتی ہے• طاقتور طبقات کو کمزوروں پر تسلط جمانے کا موقعہ ملتا ہے• فکری انتشار بڑھنے لگتا ہے• انفرادی اور اجتماعی زندگی خلفشار سے شکار ہونے لگتی ہے • جس کو جہاں بھی مال کمانے کا موقعہ ملتا ہے، وہ بے دریغ مال کمانے لگتا ہے، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوتا• قوم میں بے بسی اور بے کسی کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے• سب سے بڑی بات یہ کہ خدا کی مدد رخصت ہونے لگتی ہے• منتشر ذہن کے افراد تیار ہونے لگتے ہیں۔

یہ سارے نقصانات اس لئے ہوتے ہیں کہ قوم کی تربیت کرنے والا سب سے بڑا ادارہ قوم کی تربیت سے قاصر ہوتا ہے، اس طرح قوم سے وابستہ افراد نفس پرستی اور مادہ پرستی کی قوتوں کے حوالے ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ سے دور سے دور تک ہونے لگتے ہیں، اللہ سے دور ہونے والے افراد کو اللہ مزید دور کرنے لگتا ہے۔

اسلام سے بے پرواہی کی روش اگر اسلام کا نام لینے والے افراد کریں گے تو ان کو دوسروں کے مقابلے میں اس کی زیادہ سزا ملتی ہے۔

ہم یہاں نظام تعلیم کے حوالے سے ملت کی تین ممتاز اور بلند پایہ شخصیتوں کی تحریروں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، تاکہ اس موضوع کی اہمیت اجاگر ہو۔

علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

''مجھے رہ رہ کر یہ رنج اور تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے، روحانی طور پر ایک بے جان لاش کے ہے، اور اگر موجودہ صورتحال بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے قالب میں، ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت (قوم) کے جسم سے بالکل ہی

نکل جائے گی، وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہئے، وہ ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کی ماہیت اور نوعیت سے بہت زیادہ واقف تھے۔ (بحوالہ صدق جدید لکھنو ۱۶ مارچ ۱۹۸۴ء)

اقبال کا بیان کردہ یہ نکتہ لگ بھگ ۳۵ء کا ہے، جو موجودہ حالات کی بہتر عکاسی کرتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کتاب ''داستان عمل'' مصنف منشی عبدالرحمٰن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''قوموں کی تعمیر ان کے افراد کے کردار اور سیرت کی تعمیر سے ہوتی ہے، یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر انگریزی عہد سے پہلے ہماری زبان اور تعلیم کا بڑا سرمایہ اخلاقی کتابوں کا نصاب تھا۔ کریما سے گلستان تک جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ سرتاسر اخلاقی تھا۔ اور اس سے جو سبق ملتا تھا، وہ ہر عمر میں پڑھنے والے کے کام آتا تھا۔ انگریز آئے، تو بچوں کے لئے کتے اور بلیوں کے قصے اپنے ساتھ لائے جن سے طفلانہ دلچسپی کے سوا کوئی اخلاقی تعمیر۔ سیرت کا فائدہ۔ اور نہ زندگی کا کوئی قاعدہ معلوم ہوا۔ ہماری کتابوں میں جو کچھ تھا۔ وہ سرتاپا بزرگوں کی حکایات۔ دانایان روزگار کے حکیمانہ مقولے اور قرآن پاک اور احادیث کے احکام وارشادات تھے۔ جو عمر بھر کے ہر موقعہ کے لئے کافی تھے۔

اب جب سیاسی حالات بدل چکے ہیں۔ تو ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیمی نصاب میں بھی اصلاح ہو۔ اور پھر سے اخلاقی تعلیمات کو ہمارے نصاب میں مناسب جگہ دی جائے۔ اس وقت پاکستان کے عملہ سرکاری ملازمین۔ تجار اور عام افراد میں جو اخلاقی نقائص نظر آرہے

ہیں۔اور جن کا ہر روز اخباروں میں اظہار ہوتا رہتا ہے۔ وہ سب کا سب اسی تعلیمی نقص کا نتیجہ ہے۔

ہماری پچھلی تاریخ صرف قتل وخون اور فوج کشی کی داستان نہیں ہے، بلکہ بزرگوں، بادشاہوں، اکابر، امراء، وزراء، اہل سیاست اور اہل علم کے اخلاقی کارناموں سے لبریز ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اہل قلم اور مصنفین ان جواہر ریزوں کو یکجا کر کے قوم کے سامنے پیش کریں۔اور شعبہ تعلیم ان کو اپنے نصاب میں جگہ دے۔تاکہ نوجوانوں کے اخلاق پاک وصاف اور بلند ہوں۔ ورنہ یاد رہے کہ اخلاقی بلندی کے بغیر نہ کوئی قوم زندہ رہی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین لکھتے ہیں۔

'' اگر ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک اسلامی نظام تعلیم کی تعمیر میں دیر کی تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے چلے جائیں گے، کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اس کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے، اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دارومدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور اقتصادی قوت تعمیر پاتی ہیں، اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو جائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں، جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے، جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جو جیت جائے اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنا دی جاتی ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم اس دوڑ میں جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں، ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے، جو قوم وقت ضائع کرے گی، خواہ وہ کیسی ہی

طاقتور ہو ضرور ہار جائیگی۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات اور معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلا جائیگا اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہینگے، بلکہ ہمارے اعتقادات وتصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لیگا۔افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں، بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ (اسلام کا نظریہ تعلیم صفحہ ۳۸۔۳۹)

''کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں، بلکہ بعض اوقات چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود یقینی طور پر نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہو رہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد۔ دنیا ضرور اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔اسی طرح سے اگر کوئی قوم مر رہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اس کی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا کچھ عرصہ کے بعد، اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آجائیگی۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم مر رہے ہیں یا زندہ ہو رہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا ہم اپنے اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے ان کی سیاست پر غالب آجائیں گے، موت اور زندگی، غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیان دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی مقام نہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہمارا رخ کس طرف ہے۔ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف۔ زندگی

کی طرف یا موت کی طرف؟ اب بھی ہم اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بنا سکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دلخراش اور اندوہناک ہے۔''

''کسی قوم کا امتیازی نشان جو اسے دوسری قوموں سے الگ ایک قوم بناتا ہے اور اس کی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے، اس کا اعتقاد یا اس کا تصور حیات ہی ہوتا ہے۔ غلامی اصل میں ذہنی غلامی ہے اور آزادی ذہنی آزادی۔ جو قوم سیاسی غلامی کے باوجود اپنے نظریۂ زندگی پر قائم رہ سکتی ہے اور اسے فی الواقع اپنے فکر و عمل کا مدار محور بنا سکتی ہے، وہ درحقیقت آزاد ہے، اس کے برعکس سیاسی آزادی کے ہوتے ہوئے جس قوم کے فکر و عمل کی بنیاد غیروں کے معتقدات پر ہو، وہ آزادی کے باوجود غلام ہے سیاسی آزادی کسی قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر قوم سیاسی آزادی کو اپنی ذہنی آزادی کی خاطر حاصل کرتی ہے۔

اسی طرح سے ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے، کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہوگا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہوگا۔ لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔

'' اسلامی تعلیم کے معنی یہ نہیں کہ ہم اسلامیات کے ایک مضمون کو آٹھویں جماعت تک نصاب تعلیم میں شامل کر دیں۔ اگر ہم اسلامیات کے علیحدہ مضمون کو ایم اے اور ایم ایس سی کی آخری جماعت تک بھی شامل کریں تو اس سے ہمارا نظام تعلیم اسلامی نہیں بن سکتا۔ اسلامی نظام تعلیم وہی ہو سکتا ہے، جس میں تمام علوم کی نصابی کتابیں اسلام کے نظریہ انسان و کائنات کے مطابق ہوں۔ چونکہ اسلام کے نظریۂ انسان و کائنات کی روح خدا کا تصور ہے،

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نظام تعلیم اسلامی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس میں تمام سائنسی علوم کی نصابی کتابیں اس طرح نہ لکھی گئی ہوں کہ خدا کا عقیدہ کرنے والا مرکزی اور محوری تصور ہو۔

مغرب میں جو مختلف علوم کی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ اسلامی نظریہ کائنات کے مطابق نہیں، کیونکہ ان کتابوں کا بنیادی اعتقاد یہ ہے کہ صداقت وہی ہے، جسے ہم حواس خمسہ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ اعتقاد درست نہیں، اس لیے جو علوم اس اعتقاد کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے ناتمام اور ناقص رہ گئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نظریہ کائنات کے مطابق سب سے بڑی صداقت جو تمام صداقتوں کی ابتدا اور انتہا ہے خدا ہے۔ اگرچہ ہم خدا کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے، تاہم مظاہر قدرت کے اندر جو نظم اور مقصد کے اوصاف پائے جاتے ہیں، وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم خدا کے تصور کو ایک ایسے معقول علمی تصور کے طور پر قبول کریں، جو تمام علوم کی جان ہو۔ علوم کے متعلق مغربی تہذیب اور اسلام کے نقطۂ نظر کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسلام مغرب کے ہر علمی موقف کو من و عن تسلیم نہیں کرتا، بلکہ ہر علمی مسئلہ کے متعلق اپنے بنیادی تصورات کی روشنی میں اپنی جداگانہ رائے قائم کرتا ہے اور اپنا الگ فیصلہ صادر کرتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے نزدیک حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، درست کیا ہے ور غلط کیا ہے۔ معقول کیا ہے اور نامعقول کیا ہے؟ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ حکمت کی کتاب ہے اور اس ذات پاک نے نازل کی ہے، جو آسمان اور زمین کے اسرار و رموز کو جانتا ہے **قل انزله الذی یعلم السر فی السموات والارض۔** (اے پیغمبر کہیے کہ اسے اس ذات پاک نے نازل کیا ہے جو کائنات کے اسرار و رموز جانتا ہے) پھر قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ اس لیے

نازل ہوا ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر دے۔ **الحق الحق و یبطل الباطل** (تاکہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے دے) اور وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ علمی مسائل سمیت ان تمام مسائل کے بارہ میں اپنے فیصلے صادر کرے جن میں لوگ اختلافات رکھتے ہیں (**لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیه**۔ تاکہ ان مسائل میں لوگوں کے درمیان فیصلے صادر کرے جن میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں)۔

چنانچہ قرآن حکیم انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ہمیں ایسے تصورات عطا کرتا ہے، جس کی روشنی میں ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ قرآن حکیم کے نزدیک علم، عقل، حکمت، سائنس، طبعیات، حیاتیات، نفسیات، سیاست، فن، اخلاق، تعلیم، اقتصاد، قانون، تاریخ، ارتقا، نبوت، انسان، جبلت، نصب العین ایسے موضوعات کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان سب موضوعات کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہے۔ یہی وجہ سے کہ اسلامی نظام تعلیم میں خدا کا تصور تمام علوم کا محوری تصور ہو۔ اسلامی نظام تعلیم میں بے خدا طبعیات، بے خدا حیاتیات، بے خدا نفسیات، بے خدا سیاست، بے خدا قانون، بے خدا اقتصادیات، بے خدا تاریخ، بے خدا فلسفے، علمی نظریت کی حیثیت سے پڑھائے نہیں جا سکتے۔ بلکہ صرف ان کی منطقی اور عقلی غلطیوں کو سمجھانے کے لئے پڑھائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان علوم اور نظریات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح سے جب کوئی علم نظریہ خدا کے تصور سے الگ ہو کر وجود میں آئے تو اس میں عقلی اور منطقی خامیاں اور ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم ایسے نظریات کی خامیوں اور ناکامیوں کو دریافت کر کے آشکار کرتا ہے۔ (اسلامی تعلیم مئی، جون ۱۹۷۲ء)

بڑا بننے اور فساد پھیلانے کی سزا

قرآن میں ایک جگہ ہے۔

تلک الدار الاخرہ نجعلھا للذین لایریدون عدوا فی الارض ولا فسادا۔

(آخرت کا یہ گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے تیار کیا ہے جو دنیا میں نہ تو بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ ہی فساد برپا کرنا چاہتے ہیں)۔

اس آیت میں بڑے پن سے دستبرداری اور فساد برپا نہ کرنے پر خوشخبری سنائی گئی ہے، خوشخبری بھی معمولی نہیں، بہت بڑی، یعنی آخرت میں جنت کی صورت میں خوشخبری اور اللہ سے آخرت میں ملاقات کی صورت میں، ایک حدیث شریف میں تکبر (بڑے پن) کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جس میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہیں جائے گا، فساد کے بارے میں قرآن میں ماضی کے بعض سرکش لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے **فاکثر فیھا الفساد فصب علیھم ربک سوط عذاب** (پس ان میں اکثر نے زمین پر فساد برپا کیا پس ان پر اپنے رب کے عذاب کا کوڑہ برسا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے پن کی نفسیات اور فساد پھیلانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں محرومی کی صورت میں ملی گی۔

اپنے آپ کو بڑی شخصیت سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا، اور دوسروں پر برتری چاہنا، یہ ایسی بیماری ہے جو کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے، جس سے دوسروں سے تعلقات کشیدہ رہتے ہیں، اللہ کی زمین میں فساد پھیلانا یہ بھی سنگین جرم ہے، فساد کی ایک نوعیت تو یہ ہے کہ بااختیار یا صاحبان اقتدار، اقتدار کے نشہ میں دوسروں پر ظلم و زیادتیاں کرتے رہیں، اور ان کو

ہر صورت میں اپنا زیر دست بنائیں یہ روش ہمیشہ صاحبان اقتدار کی رہی ہے اور آج بھی ہے، فرق یہ ہے کہ آج یہ فساد پھیلانے کی روش زیادہ شدت سے جاری ہے، اللہ کی زمین پر فساد پھیلانا اور اللہ کے بندوں پر اپنا حکم چلانا، یہ روش ظاہر کرتی ہے کہ فرد اللہ کی زمین کو اللہ کی زمین نہیں، بلکہ اپنی زمین سمجھتا ہے اور اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ سمجھتا ہے۔

فساد پھیلانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اختیار اور اقتدار تو زیادہ نہیں ہے، لیکن کسی ادارہ، کسی انجمن، کسی گروہ میں کوئی حیثیت حاصل ہے، یا اگر حیثیت نہ بھی ہو تو اپنے اکڑ فونی مزاج کی وجہ سے دوسروں سے الجھنا اور ان کو پریشان کرنا اور ان سے دست و گریباں ہونا، یہ بھی فساد ہی کے زمرے میں شامل ہوتا ہے، لیکن یہ فساد کی ہلکی صورت ہے۔

تکبر اور فساد پھیلانا، یہ چیز بتائی ہے کہ فرد خدائی صفات میں شامل ہونے کا مریض ہے، ایسے فرد کی سزا جہنم ہی ہے۔

اس دور میں یہ دونوں بیماریاں کچھ زیادہ ہی ہیں، جس کی وجہ سے اللہ کی زمین میں فساد برپا ہو گیا ہے اور لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے، بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں گناہ جتنے بڑے گناہ ہیں، اسی قدر ان گناہوں کا شعور وادراک بھی سلب ہو گیا ہے۔

یہ باطنی نوعیت کے گناہ ہیں، جو باطن سے ابھر کر فرد کو بڑے پن اور فساد کی نفسیات میں مبتلا کرتے ہیں، ان باطنی گناہوں سے بچنے کے لئے محض شعور وادراک بھی کافی نہیں ہے، بلکہ باطن کی اصلاح پر زور دے کر باطن کی تہذیب کے عمل کو جاری رکھنا ہے۔

کوں سا فرد ہے، جو چاہے گا کہ وہ جہنم میں جائے، جہنم سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں بڑا بننے سے بچا جائے اور اللہ کی زمین میں فتنہ وفساد برپا کرنے سے ڈرا جائے۔

ان بیماریوں سے بچنا جہنم سے بچنا ہے، اس کے لئے نفس کو جتنے بھی مجاہدوں کے مراحل سے گزارا جائے کم ہے۔

تکبر اور ظلم وفساد کا وقت تو مختصر ہوتا ہے، لیکن اس کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے اور طویل عرصہ تک جہنم کی صورت میں بھگتنی پڑتی ہے۔

ایسے افراد کو دنیا میں بھی سزا ملتی ہے، وہ سزا یہ ہے کہ ان کے سکوں کے نظام کو درہم برہم کر دیا جاتا ہے، وہ تاریکی اور ظلمات کی حالت میں رہتے ہیں۔

ہوش سے کام لینے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

اچھاانسان بننا

ہم سب کی ضرورت

ایک حدیث شریف ہے کہ تم میں اچھاانسان، وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے اچھاہو، دوسری حدیث ہے تم میں اچھاانسان وہ ہے جو لوگوں کے لئے اچھاہو۔

یہ دونوں احادیث بتاتی ہیں کہ اچھاانسان بننا، یہ اسلام کو مطلوب ہے۔

اچھاانسان بننا اچھے معاشرے کو جنم دیناہے، یہ کام ایسا ہے جو ہم سب کی اپنی ضرورت بھی ہے تو معاشرے اور ریاست کی بھی۔ اچھاانسان بننا جتنا زیادہ اہم اور ضروری ہے، اسی قدر اس کام سے غفلت موجود ہے، ہماری تعلیم و تربیت کے سارے ادارے معاشرے کو اچھا انسان فراہم کرنے سے قاصر ہیں، سبب یہ ہے کہ اچھاانسان بننے کے لئے اندر کو بدلناپڑتا ہے، یہی کام ہے جو مشکل ہونے کی وجہ سے کوئی طاقتور ادارہ نہ صرف یہ کہ نہیں کر رہاہے، بلکہ وہ انسان بننے کے گر اور سلیقہ سے ہی سرے سے آشنا نہیں، جدید تعلیمی ادارے دنیاداری اور مادیت کا جنوں پیدا کرنے اور دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے حامل افراد تیار کر رہے ہیں، لیکن وہ اچھاانسان بنانے کے لئے نہ تو تیار ہیں اور نہ ہی ان کے اہداف میں یہ چیز شامل ہے۔

ان حالات میں اگر معاشرے کے ہر طبقہ میں مفادات کی خاطر رسا کشی کی حالت موجود ہے اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں جاری ہیں تو یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

اچھے انسان کی جگہ اگر بُرا انسان سامنے آئے گا، جو تربیت سے محروم ہوگا تو اس طرح کے بہت سارے بُرے انسان مل کر معاشرے کو فساد ہی سے دوچار کریں گے، جس کا منظر اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں، معاشرے کی اس زبوں حالی کی وجہ سے ہر شخص پریشان ہے اور غم زدگی کا شکار بھی۔

اسلام جیسی پاکیزہ تعلیمات کی موجودگی میں ہمارا یہ حشر ہو، یہ بہت بڑے المیہ کی بات ہے، اچھاانسان بننا دراصل نفس پرستی کی قوتوں کو پامال کر کے اغراض، مفادات اور مادیت سے بلند ہونے سے تعلق رکھتا ہے، جب تک نفس مہذب نہیں ہوگا، تب تک فرد اچھاانسان نہیں بن سکتا، فرد اچھاانسان نہیں بنے گا تو اپنی ذات کو بھی روزمرہ زندگی میں اذیتوں اور مشکلات سے دوچار کرے گا تو معاشرہ میں بھی فساد پھیلانے کا ذریعہ بنے گا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اچھاانسان بننے کی کاوشوں کے بغیر ہم اپنے گھروں، اداروں، جماعتوں اور سیاست وغیرہ کو جھگڑوں کا مرکز بنائے بغیر نہیں رہ سکتے، جہاں جھگڑے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا طور طریقہ اور جھگڑے کی سیاست ہو، وہاں مایوسی کی دلدل سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

اچھاانسان وہ ہوتا ہے جس سے مل کر خوشی ہوتی ہے، جو دوسروں کی تکریم کرتا ہے، جو اپنے اخلاق سے دلوں کو مفتوح کرتا ہے، غصہ کے وقت بھی نرمی و محبت کا مظاہرہ کرتا ہے، دوسروں کی دل آزاری سے بچتا ہے، اور ان کے قصوروں کو معاف کرتا ہے، جو افرادِ معاشرہ کو جوڑنے کا کردار ادا کرتا ہے، جو ایثار کا مظاہرہ کرتا ہے، دوسروں کی مدد کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ اچھا بننے سے دین و دنیا کی ساری سعادتیں وابستہ ہیں، جب کہ بُرا انسان بننے سے دنیا و آخرت میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔

تحریر مولانا عبدالمتین

مصروفیت کے باوجود وقت نکالنے کا طریقہ کار

چند گزارشات

1۔ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ وقت کو منظم انداز سے استعمال نہ کرنا زندگی میں انتشار پیدا کر دیتا ہے اور انتشار کام کے بگھڑ کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کے لیے بوجھ بن جاتا ہے جسے عام طور پر بے چینی (stress) کہا جاتا ہے۔

2۔ ماہرین کے مطابق انسان جو کام کر سکتا ہو لیکن بد نظمی کی وجہ سے نہ کرتا ہو تو یہ بد نظمی بھی انسان کو بے چین کر دیتی ہے۔

3۔ چین سکون میں آنے کا ایک بہت بڑا طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے کرنے کے کام کو سمجھے اور ان کاموں کے لیے باقاعدہ وقت طے کرے اور ان کو اپنے مقررہ وقت پر انجام دے۔

4۔ کاموں کو تقسیم کیا جائے، یومیہ، ہفتہ وار، ماہانہ اور سالانہ یا طویل المدتی مقاصد امور وغیرہ کے نام سے۔

5۔ تمام کاموں کو روزانہ یا فورا کرنے والی لسٹ میں نہ رکھیں۔

6۔ کچھ کام روزانہ کرنے کے ہوتے ہیں، جیسے ورزش، عبادت، تلاوت، ملازمت اور کاروبار وغیرہ اور کچھ کام ہفتہ وار جیسے گھریلو مصروفیات، عیادت تعزیت، صحبت اہل اللہ اور اسی طرح ماہانہ جیسے بجٹ بنانا، صدقہ کرنا وغیرہ۔

7۔ یہ طے کر لیا جائے کہ یومیہ آپ کی جامد اور پکی ٹھکی مصروفیت کون کون سی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کاموں کے وقت کو بھی اس میں شامل کر لیں، جو روزانہ

اچانک (ایمرجنسی) کی صورت میں کسی صورت کرنے ہی ہوتے ہیں اس صرف میں ملازمت، آرام، کھانا پینا، اہل خانہ اور اپنی صحت کے ضروری امور کا حساب لگالیں اور احتیاطا کچھ وقت زیادہ کا اندازہ مقرر کر لیں۔

8۔ مذکورہ طریقہ کار مقرر کرنے کے بعد دیکھ لیں کہ آپ کے پاس مزید یومیہ کتنے گھنٹے بچتے ہیں، اسی طرح ایک بات کا خاص اہتمام کر لیں کہ جن چیزوں یا لوگوں کی وجہ سے وقت ضائع ہوتا ہے ان سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کنارہ کش کر لیں۔

9۔ جو کام آپ کسی اور سے کرا سکتے ہیں تو بلاوجہ مجاہد بن کر وہ کام خود کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اوروں کو ذمہ داریاں تقسیم کرنے سے وقت، ذہن، صلاحیت، اور صحت کی بچت ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ لوگ بھی احساس ذمہ داری محسوس کرنے لگتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یاد رہے سب کچھ خود کرنا کمال نہیں ہے، لیکن سب کچھ اپنی نگرانی میں کرانا بہت بڑا کمال ہے، یہ ایسی خوبی ہے کہ انسان مر بھی جاتا ہے لیکن اس کا کام جاری رہتا ہے۔

10۔ یومیہ مصروفیت سے جو وقت بچ جائے، اسے اپنے مختلف ذاتی مقاصد کے لیے تول تول کر خرچ کیا جائے، جیسے مطالعہ، تحقیق، لکھنا پڑھنا، عبادت و ریاضت، خط و کتابت، مسیجز کے جواب دینا، لوگوں کی خدمت کرنا، صلہ رحمی، عیادت و تعزیت، خاندانی امور، اہل خانہ کے حقوق، علاقائی امور، فلاح و بہبود کے کام، قومی مقاصد، دوستوں کے ساتھ گپ شپ، کھیل ہنسی مذاق اور تفریح وغیرہ۔

مذکورہ تمام امور کو یومیہ ہفتہ وار ماہانہ سالانہ اور طویل المدت خانوں میں وقت ضرورت اور ترجیح کے موافق تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

تبسم مصباح

شبیر کی خودکشی

کی المناک واردات

(گزشتہ دنوں چکوال سے تعلق رکھنے والے ۱۵ سالہ نوجوان شبیر کی خودکشی کی خبر سوشل میڈیا کے ذریعے عام ہوئی۔ اس واقعے کی خاص بات وہ خط تھا جو اس نوجوان نے اپنی موت سے قبل تحریر کیا۔ انگریزی زبان میں لکھے گئے اس خط میں فلسفہ عدمیت کا پرچار کیا گیا تھا۔ نہلزم (Nihilism) یا عدمیت ایک ایسا فلسفیانہ نظریہ ہے جو زندگی کی بے معنویت، مطلق اخلاقی اصولوں، اور وجود اشیاء کی حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ یہ روایتی اقدار، مذہب اور عقائد کی نفی کرتے ہوئے ہر چیز کو بے معنٰی قرار دیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق دنیا میں کوئی مقصد یا معنی موجود نہیں ہے)۔ نہلزم کے اہم نکات یہ ہیں:

- وجود سے انکار: یہ مانتا ہے کہ زندگی یا کائنات کا کوئی حقیقی مقصد یا معنی نہیں ہے۔
- اخلاقی اصولوں کی نفی: یہ کسی بھی اخلاقی اصول، اچھائی یا برائی کو مطلق نہیں مانتا، یعنی کوئی چیز مستقل طور پر صحیح یا غلط نہیں ہے۔
- تشکیک: یہ انسانی علم اور حقیقت کی بنیادوں پر سخت تشکیک (شک) پیدا کرتا ہے۔
- فلسفیانہ تعلق: مشہوی فلسفی نطشے نے اس تصور کو مغربی دنیا میں مذہب اور روایتی اخلاقیات کی کمزوری سے جوڑا۔

مختصراً، نہلزم ہر قسم کے روایتی اصولوں، اقدار اور معنی کی نفی کرنے والا ایک انتہا پسندانہ فلسفیانہ موقف ہے۔ ایک محض ۱۵ سالہ نوجوان کا اس درجہ خود بیزار اور مایوسانہ طرز عمل اپنے اندر سماجی اقدار کے زوال کے حوالے سے سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ **(ادارہ)**

عدمیت: فکری انتشار سے سماجی بگاڑ تک

چکوال میں پیش ہونے والے واقعے نے ہر دردمند دل کو نہ صرف دکھی کر دیا ہے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا ہے کہ آخر ہماری نسلیں تباہی کے اس راستے پر کیسے پہنچیں؟ یہ کون سا زہر ہے جو مسلم نسلوں میں منتقل کیا جا رہا ہے؟ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر اس واقعے کو لے کر ہنگامہ برپا ہے، مگر یہ ہنگامہ کچھ عرصے بعد پردے کے پیچھے چلا جائے گا اور خاموشی چھا جائے گی۔ اس سے پہلے کہ اس خاموشی کو کوئی اور حادثہ توڑے، سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے اسباب و ذرائع کو مدنظر رکھے بغیر ہم اپنی نسلوں کو اس زہر سے نہیں بچا سکتے۔ یہ ایک ناسور ہے جو ہمارے معاشرے میں تیزی سے اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ یہ مغرب کا دیا ہوا تحفہ ہے جسے معصوم ذہن تیزی سے قبول کر رہے ہیں۔

فکر کا پہلو یہ ہے کہ یہ نظریہ کس راستے سے ہماری نسلوں میں منتقل کیا گیا اور اسے یقین کی منزلوں تک پہنچایا گیا۔ شبیر کی خودکشی اسی نظریے پر یقین اور اعتماد کا نتیجہ ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اس علم کی ضرورت ہے جو ہر مسلمان پر حاصل کرنا فرض ہے۔ کلمہ کا ایک حصہ انکاری ہے اور دوسرا اقراری ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انکاری حصہ اقراری سے پہلے رکھا گیا، مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس سے انکار؟ آج کا طاغوت کون ہے جس کا انکار کیا جائے؟ شر کیا ہے جس سے انکار کر کے اللہ کی بندگی اختیار کی جائے؟

دین کی حفاظت کے لیے بھی عصری علم اور عہد جاہلیت سے واقفیت ضروری ہے۔ شر کی معرفت اس لیے نہیں کہ ہم اسے اپنانا چاہتے ہیں بلکہ شر سے بچنے کے لئے شر کی معرفت

ضروری ہے۔ اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا ذخیرہ موجود ہے جس میں آنے والے شر وفتن سے آگاہی دی گئی ہے (تمام کتب احادیث میں باب الفتن موجود ہے)۔ یہاں بھی آپ ﷺ نے امت کی رہنمائی فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو جس طرح عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق میں رہنمائی دی، اسی طرح امت کو پیش آنے والے حوادث وفتن سے بھی آگاہی عطا کی۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ (سورۃ الانعام، آیت ۴۸)

ترجمہ: ''ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔''

بشارت کا تعلق اچھے حالات اور امور خیر کے ساتھ ہے جبکہ انذار کا تعلق برے حالات اور امور شر کے ساتھ ہے۔ خیر کے ساتھ شر سے آگاہ کرنا ہر نبی کی ذمہ داری رہی ہے، مگر امت محمدیہ ہونے کے باوجود ہم اس علم سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ زیادہ سے زیادہ سن کر حیرتوں کے پہاڑ کے نیچے دب جاتے ہیں، جبکہ صحابہ کے سامنے جب نبی ﷺ مستقبل کے فتنوں کا ذکر فرماتے تو صحابہ فوراً اپنے کرنے کے کام کے بارے میں دریافت کرتے۔ ان کا یہ سوال کرنا آج ہمارے لیے باعث رحمت ہے، مگر اس رحمت کا حقدار وہی ہوگا جو عمل کی نیت سے ان احادیث کا علم حاصل کرے گا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہاں یاد آتا ہے'': اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے اس وقت ٹوٹیں گی جب ایسے لوگ پیدا ہوں جو جاہلیت کو نہیں پہچانتے ہوں گے۔'' (مجموع الفتاویٰ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، جلد ۷)

ایک مشہور شاعر ابو فراس الحمدانی فرماتے ہیں'': میں نے شر کو اس لیے پہچانا کہ اس سے بچ سکوں، نہ کہ اسے اختیار کروں۔ اور جو شر کو نہیں پہچانتا اور خیر کو شر سے ممتاز نہیں کر پاتا، اس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ شر میں ملوث ہو جائے گا۔'' (اہل علم، اصول فہم فتن)

شبیر کی خودکشی کے پیچھے ایک ایسا نظریہ کارفرما تھا جس سے اکثریت لاعلمی کا شکار ہے۔ یہ لاوجودیت (Existentialism) کا نظریہ ہے، جو معصوم اور ذہین بچوں کو خودکشی کی طرف لے جاتا ہے۔ شبیر کی خودکشی کی وجہ اس کے آخری خط سے واضح ہوتی ہے، جس میں وہ خود کو اس نظریے کا قائل بتاتا ہے۔ یہ ایک زہریلا نظریہ ہے جو انسان کو خدا کے وجود سے انکاری بنا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں، یعنی جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض اتفاق ہے، اس کے پیچھے کوئی قوت نہیں جو اسے چلا رہی ہو۔

نہلزم (Nihilism) کا نظریہ انسانی زندگی سے مقصد اور مفہوم چھین لیتا ہے، اور اس راہ میں حائل مشکلات و مصائب کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے کی قوت جذبہ ختم کر دیتا ہے۔ جب زندگی کا مقصد نظر نہ آئے تو چھوٹی سی تکلیف یا مشقت بھی انسان کو گرا دیتی ہے۔ اللہ، انسان اور آخرت انسانی زندگی کی اہم ترین حقیقتیں ہیں۔

کسی قوم کے نظام حیات کی تعمیر اس کے نظام فکر میں موجود تصورات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اہل مغرب نے لادینی تحریک کے زیر اثر خدا اور آخرت کا انکار کر دیا۔ اب رہا انسان، تو انسان کو ہی خدا بنا دیا گیا۔ انسان کی ترقی، آزادی اور نفس کی تسکین کے لیے ہیچ سے ہیچ کام کو جائز قرار دے کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام انسانیت رکھا گیا۔ نظام ریاست کی بنیاد عوام کی خواہشات پر رکھ کر انسان کی پوجا ہونے لگی۔ عقل کو ترقی کا زینہ بنا کر مادی ترقی میں آگے سے آگے بڑھتے چلے گئے، مگر روحانی حقائق سے محروم ہو کر اپنے معاشرتی اقدار اور خاندانی نظام کو تباہ کر بیٹھے۔ انہیں احساس اس وقت ہوا جب یہ بنیادی کڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

اب یہی حملہ امت مسلمہ پر چپکے سے کیا جا چکا ہے، اور امت مغرب کے اخلاقی زوال سے سبق لینے کے بجائے ان کی مادی ترقی سے مرعوب ہو کر ان کی تقلید کی راہوں پر گامزن

ہے۔ ان راہوں پر چلنے کے نتائج آج ہمارے معاشرے میں نظر آنے لگے ہیں۔ چکوال میں ہونے والا واقعہ بھی اس کی ایک کڑی ہے۔

عقیدے کی آبیاری کے لیے سب سے مضبوط قلعہ خاندانی نظام ہوتا ہے۔ اسی خاندانی نظام پر کاری ضرب لگا کر اس قلعے کی دیواریں توڑی جارہی ہیں۔ بچوں کی تربیت گھر کے بزرگوں کے بجائے سوشل میڈیا کے ذریعے کی جارہی ہے، یا گھروں میں موجود خادمائیں یہ فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ مادیت کی دوڑ میں لگے والدین اس فرض سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ خاندانی نظام پر یہ ضرب بڑی کاری ثابت ہوئی، جس کا سب سے بڑا نقصان نئی نسل کا اپنے بنیادی عقائد سے ناواقفیت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

دنیا حاصل کرنے کی محنتوں میں انسان کو لگا کر اسے محض ایک پرزہ بنادیا گیا تاکہ وہ دنیا کے کارخانے میں فٹ سو سکے۔ عقل کی حکمرانی میں ایسی نسلیں پیدا ہو گئیں جو سائنس کی ترقی میں آگے سے آگے بڑھتی چلی جارہی ہیں، مگر اس مادی ترقی کے نیچے دبی انسانی روح کی سسکیاں کسی کو سنائی نہیں دیتیں۔ نتیجتاً ایک بیمار روح کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور فطرت سے بغاوت کے نتیجے میں روح و جسم دونوں گھائل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل وادراک کی قوت انسان کو ودیعت فرمائی ہے مگر عقل کا دائرہ عالم مادیت تک ہے اس لیے عقل کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ وحی الٰہی کے زیر نگرانی اپنا کام انجام دے۔ عقل اگر اس قید سے آزاد ہو گی تو ٹھوکر کھائے گی۔ ایک مشہور مفکر لکھتا ہے:

''اب اس بات پر یقین ہو گیا ہے کہ موجودہ دور کی بے چینی خاص طور پر اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ عقل نے سائنس کے نام پر، جو ابھی تک گہوارہ اطفال میں ہے اور بلوغت کو نہیں پہنچی ہے، انسان کو زندہ رہنے کے لیے ہر قسم کی امنگ اور معقولیت سے محروم کر دیا ہے۔

اس نے نظریہ حیات یعنی مذہب ہی کو ختم کر ڈالا ہے جو ابھی تک زندگی کا مفہوم متعین کرتا تھا، جو جدوجہد حیات میں حصہ لینے کے لیے انسان کو ابھارتا تھا۔ جو مادیت سے بلند ایک نصب العین متعین کرتا تھا۔'' آگے چل کر وہ لکھتا ہے ان سب باتوں کے نتیجے میں اخلاق انسانی کی موت ہو گئی، روحانیت دم توڑ گئی یعنی ختم ہو گئی۔ دنیا میں بیکار محض ہونے کے تصور جانکاہ نے ذہنوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔

Man, the Unknown Alexis Carrel (باب: مذہب سے محرومی اور اخلاقی بحران پر بحث

۱۴۰۰ سال پہلے قرآن مجید نے لادینیت کے مرض سے پھیلنے والے نقصان کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور متنبہ کر دیا تھا کہ خدافروشی کا نتیجہ ہمیشہ خود فراموشی اور کس صورت میں ظاہر ہوتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۔ (الحشر:۱۹)

ترجمہ: ''اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو (اس کی پاداش میں) اللہ نے انہیں ان کا آپ ہی بھلا دیا۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور خلیفتہ اللہ فی الارض مقرر کیا۔ اسے حیوانی جسم کے ساتھ نور کا امتزاج یعنی روح عطا کر کے فرشتوں اور جنات کے لیے مسجود بنایا، یعنی ایک بہترین شاہکار:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۔ (سورۃ التین، آیت ۴)

ترجمہ: ''بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر تخلیق کیا۔''

اہل مغرب اس امر کی جانب سے بالکل غافل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا'': ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیااور انسان میں اپنی روح پھونکی۔'' (سورۃ السجدہ، آیت ۹)

یہ دراصل سائنس کے اس اعلان کی نفی ہے جو انسان کو محض ایک مادی وجود قرار دیتی ہے، جو اس کی اصل حقیقت سے غافل اور انسان کو محض ایک حیوان سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سے نوازا جس کے ذریعے وہ کائنات میں غور و فکر کرتا ہے اور پھر پردے کے پیچھے چھپی سنت الٰہی اور قانون فطرت کو تلاش کر لیتا ہے جو اسے اللہ کی معرفت عطا کرتا ہے۔ تخلیق انسانی کے ساتھ اللہ نے معرفت الٰہی بھی انسان کو عطا کی، جو خواہشات اور غفلت کی دھول کے نیچے دب جاتی ہے۔ جب یہ دھول اللہ کی معرفت پر پردہ ڈال دے تو کائنات اللہ کی نشانی ہونے کے باوجود رب کی یاد نہ دلا سکے، تو یہ انسان کی بد قسمتی اور محرومی کے سوا اور کیا ہے۔

محمد طفیل کوہاٹی

مذہبی ہم آہنگی اور وحدت ادیان کا فتنہ

آہنگ آوازوں کے ایسے سلسلے کو کہا جاتا ہے جو بالکل یکساں اور متحد ہوں۔ مذہبی ہم آہنگی اس وقت مغرب کا سرفہرست ایجنڈا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے ادیان و مذاہب میں یکسانیت و اتحاد پایا جائے یعنی اگر ایک اچھا تو دوسرا بھی اچھا ایک سچا تو دوسرا بھی سچا۔ یہی مفہوم ذرا وضاحت کے ساتھ وحدت ادیان کا لفظ ادا کرتا ہے کہ دنیا کے سارے ادیان کا بنیادی پیغام یکساں ہے اور سارے ہی ادیان برحق ہیں معاذ اللہ۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے، تب وہ اونٹ کا گوشت کھانے سے طبعاً متنفر تھے کیونکہ زمانہ یہودیت وہ اس کو حرام سمجھتے تھے، انہوں نے سوچا کہ اسلام میں اونٹ کا گوشت کھانا کوئی لازمی یا واجبی امر تو ہے نہیں، میں اونٹ کا گوشت بدستور نہیں کھاؤں گا، یوں یہودیت اور اسلام دونوں کے منشا پر عمل ہوتا رہے گا۔ اس پر انہیں سختی سے روکا گیا کہ یہ گوشت کو تو کھانا ہوگا کیونکہ یہود کی مخالفت مطلوب ہے۔ (بیان القرآن)

اس جذبے سے کسی مباح امر کو ترک کر دینا کہ اس سے کسی کفریہ مذہب سے ہم آہنگی پیدا ہو سخت کوتاہی اور گمراہی کا پیش خیمہ ہے۔ آج کل یہ فتنہ عام ہے کہ لوگ عیسائی اور ہندو تہواروں میں شرکت کرتے ہیں پھر وہاں سورۃ کافرون کی آخری آیت لکم دینکم ولی دین پڑھ کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارا دین مبارک (معاذ اللہ) اور ہمارے لیے ہمارا دین۔ گویا دونوں درست ہیں۔ حالانکہ بیان القرآن میں ہے:

''سبب نزول اس سورت (الکافرون) کا یہ ہے کہ ایک بار چند رؤسائے کفار نے آپ (علیہ الصلاۃ والسلام) سے عرض کیا کہ آیئے! ہمارے معبودوں کی آپ عبادت کیا کیجئے اور آپ کے معبود کی ہم عبادت کیا کریں جس میں ہم اور آپ طریق دین میں شریک رہیں جو نسا

طریقہ ٹھیک ہوگا اس سے سب کو کچھ کچھ حصہ مل جاوے گا اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔''
(ج:۳، ص:۶۹۱ط: مکتبہ رحمانیہ لاہور)

اسی میں مذکورہ آیت کریمہ ''لکم دینکم ولی دین'' (الکافرون:۶) کا یوں ترجمہ کیا گیا ہے:

''تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا۔'' (ج:۳۔ص:۶۹۱۔ط: مکتبہ رحمانیہ لاہور)

تفسیر عثمانی میں ہے: ''حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں'' یعنی تم نے ضد باندھی اب سمجھانا کیا فائدہ کرے گا جب تک اللہ فیصلہ کرے اب ہم تم سے بالکلیہ بیزار ہو کر اسی فیصلہ کے منتظر ہیں اور جو دین قویم اللہ نے ہم کو مرحمت فرمایا ہے اس پر نہایت خوش ہیں تم نے اپنے لیے بد بختی سے جو روش پسند کی وہ تمہیں مبارک رہے ہر ایک فریق کو اس کی راہ و روش کا نتیجہ مل رہے گا۔'' (ج:۳۔ص:۹۱۹۔ط:دارالاشاعت کراچی)

مفتی محمد شفیع صاحب (رحمہ اللہ) تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

''تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا، اس میں ان کے شرک پر وعید بھی سنا دی گئی۔ یہاں لکم دینکم کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رکھنے کی ضمانت دے دی گئی بلکہ اس کا حاصل وہی ہے جو لنا اعمالنا ولکم اعمالکم کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھگتو گے۔'' (ج:۸۔ص:۸۳۲۔ط:مکتبہ معارف القرآن کراچی)

گویا جو آیت کفر و اسلام کے امتیاز کے لیے اتری تھی جو اس بات کو بیان کرنے آئی کہ کفر و اسلام کبھی ایک راہ نہیں ہو سکتے۔ یہ دو جدا راہیں ہیں۔ ایک کا انجام دائمی کامیابی و جنت ہے جبکہ دوسری راہ کا انجام دائمی ناکامی اور جہنم ہے۔ موجودہ الحادی دور کے رجحانات نے اس آیت میں بھی تحریف کر دی اور اس سے وحدت ادیان اور مذہبی ہم آہنگی کو ثابت کیا جانے لگا۔ کیا زمزم اور پاخانہ بھی برابر ہو سکتے ہیں؟ معاذ اللہ۔ کیا صاف و ستھرا دودھ اور پیشاب ایک

ہوں گے؟ حق و باطل کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ **ان الدین عند اللہ الاسلام** نے اس پر مہر ثبت کر دی کہ خدا کے ہاں راہ حق ہے ہی صرف اسلام۔ **ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ**۔ جو اس راہ حق کے علاوہ کو بھی قابل قبول مقام دے گا، یاد رکھیں! وہ خدا کے ہاں ہر گز قبول نہیں۔ قرآن نے بہت دوٹوک انداز میں یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ اندھا وبینا برابر نہیں۔ نور و ظلمت برابر نہیں۔ دھوپ اور چھاؤں برابر نہیں۔ ان طرح طرح کی مثالوں سے قرآن مجید سمجھا رہا ہے کہ کفر کے ساتھ کلیسازگاری و ہم آہنگی کا اسلام قطعاً روادار نہیں۔ اسلام سب پر بلند و فائق ہونے آیا ہے، **الاسلام یعلو ولایعلیٰ**۔ وہ اس لیے آیا ہے کہ سب پر غالب رہے۔ **لیظھرہ علی الدین کلہ**۔ وہ اس لیے نہیں آیا کہ دوسروں کے صف میں برابر دکھائی دے جو لوگ اسلام کو دیگر ادیان و مذاہب کے برابری میں لانا چاہتے ہیں۔ یہ احمق اسلام کو اپنے مرتبہ سے نیچے گرانے کا جرم کر رہے ہیں۔

شاہنواز فاروقی

کیا مذہب ایک نشہ ہے؟

ایک یہودی وکیل کے گھر جنم لینے والا کارل مارکس ایک منکرِ خدا تھا۔ وہ مذہب کو 'عوام کی افیون' کہتا تھا۔ دنیا میں جتنے بھی کمیونسٹ اور سوشلسٹ پیدا ہوئے انہوں نے اس خیال کو عام کیا کہ عیسائیت، یہودیت، ہندوازم یا اسلام، سب ایک 'نشہ' ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب ایک نشہ ہے جو انسان کو حقیقی مسائل سے دور رکھتا ہے۔ اس نشے میں انسان اپنی خرابی کی اصل وجہ ڈھونڈ نہیں پاتا۔ اور اگر اس نے وہ وجہ دور کرنے کی کوشش کی تو پھر اپنے حق کے لیے ظالموں کا تختہ بھی الٹ سکتا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی سابق اور موجودہ کمیونسٹ عناصر اس بات کو دہرا رہے ہیں۔ آیئے اس غلط نظریے کا جائزہ لیتے ہیں۔

مذہب اپنی پوری تاریخ میں سب سے بڑی انقلابی قوت رہا ہے اور اس نے وقت کی باطل اور غالب قوتوں کو للکارا ہے۔ سیدنا ابراہیمؑ کے پاس نہ حکومت تھی، نہ ریاست تھی، نہ فوج تھی، نہ کوئی سیاسی جماعت تھی، اس کے باوجود انہوں نے وقت کے بادشاہ نمرود کی خدائی اور اس کے غلبے کا انکار کیا۔

سیدنا موسیٰؑ اور ان کے بھائی سیدنا ہارونؑ کے پاس بھی کوئی حکومت، ریاست، فوج اور پارٹی نہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے فرعون کی فرعونیت کا انکار کیا۔ رسول اکرم ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو کفر اور شرک کے پاس مالی طاقت بھی تھی اور عسکری قوت بھی۔ رسول اکرم ﷺ کے پاس کوئی مادی طاقت نہ تھی مگر انہوں نے کفر اور شرک کی قوتوں کو للکارا۔

اسلام کے بنیادی کلمے لاالہ الااللہ سے زیادہ انقلابی کلمے کا تصور محال ہے۔ یہ کلمہ لا سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی نہیں ہے کوئی خدا سوائے اللہ کے یہ کلمہ اپنے پہلے حصے میں دنیا کے تمام

جھوٹے خدائوں کا انکار کر دیتا ہے۔ خواہ وہ جھوٹا خدا کوئی بادشاہ ہو، کوئی ریاست ہو، کوئی سردار ہو، کوئی طبقہ ہو، یا کوئی گروہ ہو۔ یہ کلمہ دولت کی خدائی کا بھی منکر ہے اور طاقت کی خدائی کا بھی۔ یہ انا کی خدائی کا بھی انکار کرتا ہے اور نفس کی خدائی کا بھی۔

مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب نے قیصر کی خدائی کو تسلیم کیا نہ کسریٰ کی خدائی کے آگے سر جھکایا۔ اس نے نہ سوویت یونین کی خدائی کو تسلیم کیا نہ امریکا کی خدائی کے آگے سجدہ کیا۔ کیا اتنے بڑے بڑے کام انسان نشے کی حالت میں کر سکتا ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ مذہب نشہ نہیں شعور ہے۔ مذہب افیون نہیں سب سے بڑا اور سب سے برتر علم ہے۔ مذہب انسان کو سلاتا نہیں بیدار کرتا ہے، مذہب نہ ہوتا تو انسانی تہذیب کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے کبھی مذہب کی عطا پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔

مذہب کی سب سے بڑی عطا ایک خدا کا تصور ہے۔ مذہب نہ ہوتا تو انسان کبھی اپنے خالق، مالک اور رازق کو نہیں جان سکتا تھا۔ خدا کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اس لیے اسے نہ جان سکنا انسان کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔ اقبال نے ایمان کی اہمیت کو عیاں کرتے ہوئے کہا ہے۔

ولایت، پادشاہی علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یعنی خدا اگر انسان کو اپنا ولی یا اپنا دوست بناتا ہے تو ایمان کی وجہ سے۔ اسے دنیا کی حکمرانی عطا کرتا ہے تو ایمان کے سبب سے۔ اسے علم اشیاء کی جہانگیری سے نوازتا ہے تو ایمان کی بدولت۔ تو کیا زندگی میں انقلاب برپا کرنے والا ایسا ایمان بھی نشہ ہے؟

مذہب کی ایک عطا قرآن ہے۔ قرآن صرف کتاب ہدایت نہیں وہ کتاب انقلاب بھی ہے۔ قرآن پوری انسانی تہذیب کو عدل کی میزان پر استوار کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ زندگی میں

اہمیت طاقت اور دولت کی نہیں بلکہ تقوے اور علم کی ہے۔ کیا کوئی نشہ انسان کے خیالات میں اتنی بڑی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے؟

اسلام نے دنیا کو ایک ایسی تہذیب اور ایسی انسانی شخصیات عطا کیں جن کی مثال پوری انسانی تاریخ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا کی کون سی تہذیب اور کون سا معاشرہ ایسا ہے جس کے پاس رسول اکرم ﷺ جیسی شخصیت موجود ہے؟ ابو بکر، عمر، عثمان اور علی جیسے انسان ہیں؟ کیا کسی اور تہذیب میں ایسے لوگ گزرے ہیں؟

کیا کسی غیر مسلم معاشرے کے پاس کوئی جنید بغدادی ہے؟ کوئی محی الدین ابن عربی ہے؟ کوئی مجدد الف ثانی ہے؟ کوئی علی ہجویری ہے؟ کیا جن صوفیا نے کروڑوں انسانوں کو بدلا وہ نشے کے عادی تھے؟

دنیا نے بہت عظیم آسمانی اور غیر آسمانی کتابیں دیکھی ہیں۔ مگر مسلمانوں نے قرآن و سنت کی بنیاد پر علم کا جو سمندر تخلیق کیا اس کی کوئی مثال موجود ہے؟ دنیا میں ایک لاکھ 24 ہزار انبیا آئے سیکڑوں بڑے مفکرین پیدا ہوئے لیکن جیسا علم حدیث مسلمانوں نے پیدا کیا ویسا کسی تہذیب اور کسی معاشرے کے پاس نہیں۔

مسلمانوں نے شاعری کی اتنی بڑی روایت پیدا کی کہ اگر مسلمانوں کے صرف ایک شاعر مولانا روم کا کلام ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دنیا کے سو عظیم شاعروں کا کلام دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو مولانا کی شاعری کا پلڑا بھاری ہو گا۔

آج مغرب کے پاس جتنے **علـــــوم** ہیں وہ انہوں نے مسلمانوں سے حاصل کیے ہیں۔ مسلمانوں کے بغیر مغرب آئن اسٹائن اور ٹیوٹن پیدا ہی نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ فلسفہ مسلمانوں نے مغرب کو دیا۔ طبعیات مسلمانوں نے مغرب کو سکھائی۔ منطق میں مسلمان مغرب کے استاد تھے۔ فلکیات، کیمیا اور ریاضی کا علم مغرب نے مسلمانوں سے سیکھا۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ سارے علمی کارنامے نشے کی حالت میں انجام دیے؟

مسلمانوں نے سیدنا عمرؓ کے زمانے میں وقت کی دو سپر پاور زیعنی قیصر و کسریٰ کو منہ کے بل گرایا۔ محمد بن قاسم نے 17 ہزار کے لشکر کے ذریعے راجا داہر کی ایک لاکھ فوج کو ہرایا۔ طارق بن زیاد نے 18 ہزار فوجیوں کے ذریعے ایک لاکھ کے لشکر کو شکست دی، بابر کے پاس صرف 8 ہزار فوجی تھے اور اس کے سامنے بھی ایک لاکھ کا ہندوستانی لشکر تھا۔ کیا یہ سب کچھ نشے کی حالت میں ہوا؟

کیا بیسویں صدی میں روس اور اکیسویں صدی میں امریکہ و اسرائیل کا غرور خاک میں ملانے والے مسلمانوں نے بھی نشے کی حالت میں جنگی کارنامے سرانجام دئے؟ خدا کے وجود کے منکر اور مذہب کو عوام کی افیون قرار دینے والے ہمیں بتائیں کہ کیا مذہب کا نشہ کرنے والے اتنے شاندار کام سرانجام دے سکتے ہیں؟

مولانا محمد حنیف ندوی

توحید اور غیر سائنسی افکار و توہمات

توحید کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسانی فکر و تدبر خالصتاً سائنسی اور علمی اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور ذہن توہمات اور بت پرستی کے تمام پردوں کو چاک کر کے اس روشنی کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات نظم و قاعدے کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اس میں علل واسباب کی ہم آہنگی اور استواری ہے۔ اس میں ایک ہی قانون کا چلن ہے اور ایک ہی فطرت کی کارفرمائی جلوہ گر ہے کیونکہ اگر یہاں دو خدا ہوں، دو قانون ہوں اور تخلیق وآفرینش کے اختیارات دو یا اس سے زیادہ طاقتوں میں انضمام پذیر ہوں تو یہ کارخانہ کھٹ سے برباد ہو کر رہ جائے: ''اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔'' (الانبیاء: ۲۲)

کائنات کی وسعتوں اور بوقلمونیوں کے باوجود اس میں قانون کی یک رنگی، استواری اور نتائج واسباب میں نپے تلے ایک ہی نہج کی نشان دہی ایسی چیزیں ہیں جن سے ان تمام غیر سائنسی افکار توہمات کا خاتمہ ہو جاتا ہے جن کو شرک نے پیدا کر رکھا تھا۔ اور ہمیں کہنے کی اجازت دیجیے، کائنات کے بارے میں یہی وہ صاف ستھرا عقیدہ تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں میں علم و تحقیق کے دریچوں کو وا کیا، جس نے سائنسی رجحانات کی پرورش کی اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یونان کے خزائن فکری سے استفادہ کریں۔ ہم مستشرقین کے اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں کہ مسلمانوں میں علوم وفنون کے لیے تشنگی کا اظہار خارجی اسباب سے اُبھرا، یعنی انہوں نے محض اس وقت فلسفہ اور منطق کی طرف اپنی رغبت و میلان کا اظہار کیا جب ان کو مختلف اقوام کے ساتھ بحث و مناظرے کے درمیان اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے جان لیا کہ یونانی علوم سے آراستہ ہوئے بغیر اسلامی

تہذیب کی برتری ثابت کرنا دشوار ہے۔ ہم اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب دوسرے فکری دھاروں کا سامنا کیا تو انہیں بحث و مناظرے کی مصلحتوں کے پیش نظر اس دور کی تابش وضیا سے قلب وذہن کو منور کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی، مگر صرف اتنی سی بات سے مسلمانوں کے اس عظیم تر جذبۂ تحقیق و تفحص کی توجیہ نہیں ہو پاتی جس کے پیش نظر یہ جملہ علوم وفنون کی طرف دیوانہ وار بڑھنے پر مجبور ہوئے کہ زمین کا کونہ کونہ چھانیں۔ علم النجوم کے رازوں کو دریافت کریں۔ طبیعیات میں نئے نئے تجربے کریں۔ طب، فلسفہ اور منطق کے سرچشموں سے پیاس بجھائیں اور اس جہاد علمی میں اپنی ہم عصر قوموں سے فخر و پندار کے علم چھین لیں۔ اس جذبۂ طلب و جستجو کے پیچھے جو اسباب کارفرما تھے، وہ سراسر داخلی تھے۔ یہ قرآن کی اس تعلیم کا فیض تھا جس نے مسلمانوں کو کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی، جس نے مشرکانہ توہمات پر کاری ضرب لگائی اور توحید کے ذریعے اس یقین کو بیدا کیا کہ اس کارگاہ حیات میں نتیجہ وسبب میں جو لزوم پایا جاتا ہے اور اسباب کی کڑیاں جس طرح مسببات سے وابستہ ہیں، اس میں صرف ایک ہی قانون اور قاعدے کا چلن ہے۔ اس میں دو رنگی پائی نہیں جاتی کیونکہ اگر اس کائنات کا پروردگار ایک اور یقیناً ایک ہے تو منطقی طور پر اس میں دو ارادے، دو قانون اور فرماں روائی کے دو الگ الگ اسلوب پائے نہیں جا سکتے۔ (اساسیاتِ اسلام، ص: ۸۵۔۸۷)

ہمارے کچھ اہم معاملات
احادیث نبوی کی روشنی میں

نیکی کے عمل پر دس نیکیوں سے
سات سو گنا تک ملنے کی خوش خبری کا ہونا

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھیں، پھر انہیں صاف بیان کر دیا، لہذا جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور اس کے مطابق عمل بھی کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے پاس دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیاں لکھ دیتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھا کر لکھتا ہے، اور جس نے بُرائی کا ارادہ کیا، لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے پاس پوری نیکی لکھ دیتا ہے اور اگر اس نے بُرائی کے ارادے کے بعد اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اس کے لئے ایک ہی بُرائی لکھتا ہے۔ (صحیح بخاری ۶۴۹۱)

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں ہر عمل پر دس سے سات سو گنا تک نیکیاں لکھ دیتا ہے، اللہ کی اس رحمت سے نفع اٹھا کر اللہ کی دی ہوئی مہلتِ عمر کو نیکیوں میں صرف کرنا چاہئے۔ یہ خوش نصیب افراد ہی کا کام ہے جو ایسا کرتے ہیں، یہ بھی اللہ کی رحمت ہے کہ بُرائیوں کے ارادے پر پکڑ نہیں ہے اور ایک برائی کا گناہ صرف ایک گناہ ہی شمار ہو گا، یہ اس کی شان رحیمی ہے۔

شہرت کے طالب کی سزا

فرمایا: جو انسان شہرت کا طالب ہو، اللہ تعالیٰ اس کی شہرت کی حالت سب کو سنا دے گا، اسی طرح جو کوئی لوگوں کو دکھاوے کے لئے نیک کام کرے گا اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کی ریاکاری ظاہر کرے گا۔ (صحیح بخاری ۶۴۹۹)

شہرت کی طلب بُری بلا ہے، موجودہ دور میں چونکہ سوشل میڈیا کے ذریعہ مفت میں شہرت حاصل کرنے کے سب کو مواقع مہیا ہیں، اس لئے ان مواقع سے ہر ذہین و باصلاحیت فرد فائدہ اٹھانے کے لئے کوشاں ہے، شہرت سے بچ کر محض اللہ کے لئے کام کرنا، اگرچہ دشوار ہے، لیکن ایسے شخص کو ایک تو قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ آخرت میں رسوائی سے بچ جائے گا، آخرت میں رسوائی سے بچنا معمولی کامیابی نہیں ہے، بہت بڑی کامیابی ہے، قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے، جو آگ سے بچایا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی کامیاب (انسان) ہے۔

اپنے بھائی سے حساب کتاب معاف کرانے کی اہمیت

فرمایا: جس نے اپنے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اسے چاہئے کہ اس سے معاف کرا لے کیونکہ وہاں درہم و دینار نہیں ہوں گے، قبل اس کے بھائی کا بدلہ چکانے کے لئے اس کی نیکیوں سے کچھ لیا جائے، اگر اس کی نیکیاں نہیں ہوں گی تو مظلوم بھائی کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی۔ (صحیح بخاری ۶۵۳۴)

اللہ کی راہ میں ایک صبح
یا ایک شام گزارنے کی اہمیت

فرمایا: اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام گزارنا دنیا و مافیھا سے بہتر ہے۔ (مسند اسحاق حدیث نمبر: ۵۱۹)

یہ حدیث شریف پہلے بھی آچکی ہے۔

اس حدیث شریف میں اخلاص کا ساتھ اللہ کے دین کے دعوت کے کام کی ترغیب ہے کہ ایسے فرد کا تھوڑا سا وقت بھی اس کام میں صرف کرنا اللہ کو بہت پسند ہے، اور دنیا ومافیھا سے بہتر ہے، جو افراد اپنی ساری زندگیاں اللہ کے دین کے فروغ میں صرف کرتے ہیں، ان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

عمر کے بڑھنے سے درازئ عمر کی خواہش کا ہونا

فرمایا: انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے، اس کے ساتھ دو چیزیں بھی اس کے اندر پروان چڑھتی ہیں، ایک مال کی محبت دوسری درازئ عمر کی خواہش۔ (ترمذی ۲۳۳۹)

یہ حدیث شریف الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ دوسری جگہ بھی آچکی ہے، مال کی محبت اور عمر کے بڑھتے رہنے کی طلب، یہ عمر بڑھنے کے ساتھ اکثر پیدا ہوتی ہے، عمر بڑھنے کی طلب اس اعتبار سے صحیح ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے آخرت کا توشہ جمع کیا جائے۔

تم آخرت کے طلب گار بنو، دنیا کے نہیں

فرمایا: دنیا پیٹھ پھیرنے والی ہے اور آخرت سامنے آرہی ہے، ان دونوں (دنیا وآخرت) میں سے ہر ایک کے طالب ہیں، تم آخرت کے طلب گار بنو، دنیا چاہنے والے نہ بنو، بلاشبہ آج عمل کا موقعہ ہے اور کل حساب ہوگا، عمل کا موقعہ نہیں ملے گا۔ (صحیح بخاری ۶۴۱۷)

دنیا کی زندگی تیزی کے ساتھ رخصت ہورہی ہے اور آخرت سامنے کی بات ہے، دونوں کے طالب موجود ہیں، دنیا کے طالب کثرت سے موجود ہیں، اس لئے کہ دنیا نقد ہے، آخرت چھپادی گئی ہے، خوش نصیب ہے وہ فرد جو دنیا کی چاہت سے بچ کر آخرت کی تیاری میں مصروف ہو کہ اصل زندگی وہی ہے۔

شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو

فرمایا: شام ہو جائے تو صبح کے منتظر نہ رہو، اور صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو، تندرستی کی حالت میں وہ عمل کرو، جو بیماری کے دنوں میں کام آئیں اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت خیال کرو۔ (صحیح بخاری ۶۴۱۶)

اسلام فرد کا ایسا مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر موت کے لئے تیار ہو، نیز دنیا کے حوالے سے اس کی کوئی زیادہ منصوبہ بندی نہیں ہوتی، صبح ہوتی ہے وہ آخرت کی فکر کے ساتھ اٹھتا ہے، رات ہوتی ہے تو موت کے دھیان کے ساتھ سوتا ہے، یہ اس کی روزمرہ زندگی کا معمول ہوتا ہے، مومن کوشاں ہوتا ہے کہ صحت کی حالت میں زیادہ سے زیادہ اعمال کرے۔

میرے دوست سے دشمنی اختیار کرنے والے کے خلاف اعلان جنگ کا ہونا

فرمایا: (حدیث قدسی میں) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے میرے کسی دوست سے دشمنی اختیار کی، میری طرف سے اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ (صحیح بخاری ۶۰۲۱)

اللہ کے دوستوں سے دوستی کا تعلق قائم کرنا، اللہ سے تعلق مستحکم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے کہ اللہ کے دوستوں کا اللہ سے محبت کا تعلق استوار ہوتا ہے، اللہ کی اطاعت ان کا وظیفہ بن جاتی ہے، وہ اللہ سے اتنے مانوس ہو جاتے ہیں کہ غیر اللہ سے ان کی مانوسیت ختم ہو جاتی ہے، اللہ کے دوستوں سے دشمنی اللہ سے جنگ کے مترادف ہے، یہ سخت انتباہ ہے، جو اللہ کے دوستوں کے مخالفوں کو دیا گیا ہے، یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ موجودہ دور میں دلوں سے اللہ کے دوستوں کی قدر وقیمت ختم ہوگئی ہے، حالانکہ دین کی حقیقت اور اس کی روح تک

رسائی اللہ کے دوستوں سے (جنہیں اصطلاح میں اہل اللہ کہا جاتا ہے) دوستی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے، کتابوں سے دین کے علمی اور ذہنی خطوط متعین ہوتے ہیں اور دین کی علمی طور پر بنیادی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، دین پر چلتے رہنے اور اخلاق حسنہ کی سعادت اللہ کے دوستوں سے دوستی کا تعلق استوار کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے، اس نکتے کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ عملی طور پر دین سے دور تر ہوتا جارہا ہے، جب تک اللہ کے دوستوں کی مخالفت کی روش ختم کرکے، ان سے دوستی کی صورت پیدا نہ ہوگی، ہمارے حالات میں بہتری پیدا نہ ہوگی۔

اللہ کے دوستوں کی علامت یہ ہے کہ ان کی صحبت سے اللہ یاد آنے لگتا ہے اور دنیا کے اثرات کم ہونا شروع ہوجاتے ہیں، آخرت کی فکرمندی بڑھنے لگتی ہے اور اللہ کا رنگ رفتہ رفتہ غالب ہونے لگتا ہے، یہ علامتیں جہاں بھی ہوں گی، وہ اللہ کا دوست شمار ہوگا، اس کی دوستی اللہ کی دوستی کے مترادف ہے، اس کی دشمنی اللہ سے دشمنی شمار ہوگی۔

نوافل کے ذریعہ قرب حاصل کرنے والے سے اللہ کے خصوصی معاملات

فرمایا: میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے وہ پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے تو میں اسے وہ ضرور عطا کرتا ہوں اور کسی چیز سے پناہ

طلب کرے تو اسے ضرور اس سے پناہ دیتا ہوں۔ (بخاری شریف) کتاب الرقاق، باب التواضع، ج: ۸، ص: ۱۰۵، رقم: ۶۵۰۲)

نوافل یا نفلی عبادت سے اللہ کا مقرب بن جانا اور اللہ کے رنگ میں رنگ کر اللہ سے قریب تر ہوجانا اور اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں مدغم کرنا، اس کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے رحمت کی بارش کرنا، اس حدیث سے ثابت ہے، ایسے افراد کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے، یہ سعادت نوافل یا نفلی عبادت کی کثرت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

نفلی عبادت کی کثرت سے نفس کی قوت مضمحل ہوکر مکمل طور پر اللہ کے تابع ہونے لگتی ہے، فرد کی چاہت وہی ہونے لگتی ہے، جو اللہ کی چاہت ہوتی ہے، اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے دشمنی فرد کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے، جب یہ سب کچھ ہوجاتا ہے، جو والہانہ محبت سے ہوتا ہے تو پھر اللہ بندے کے کان بن جاتا ہے، اس کے ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہے، اللہ کی طرف سے یہ سعادت عظمیٰ جس کو عطا ہوجائے، وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب ترین فرد شمار ہوتا ہے۔

میت کا تین چیزیں اپنے پیچھے چھوڑ جانا

فرمایا: تین چیزیں میت کے پیچھے رہ جاتی ہیں، پس دو چیزیں واپس آجاتی ہیں، اور ایک اس کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے، اس کے گھر والے، اس کا مال واپس آجاتے ہیں، اور اس کا عمل (اس کے ساتھ) باقی رہ جاتا ہے۔ (سلسلہ احادیث صحیحہ ۱۷۸۱)

یہ حدیث شریف ہمیں قبر کی تیاری پر اکسانے کا ذریعہ بن سکتی ہے کہ قبر میں اعمال ہی کام آئیں گے، مال واولاد تو دنیا میں ہی رہ جاتے ہیں، اعمال اگر صالح ہوں گے، اعمال میں اگر

اخلاص موجود ہوگا تو قبر وحشر کی گھاٹیاں آسان ہوں گی، ورنہ فرد کی دائمی زندگی عذاب بن جائے گی، اللہ ہمیں قبر کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ کا دھیان رکھو تو اللہ کو سامنے پاؤ گے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے) رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا، میں تجھے چند اہم چیزوں کی نصیحت کرتا ہوں (انہیں یاد رکھ) (ایک) اللہ کے (احکام کی) حفاظت کر، اللہ تیری حفاظت کرے گا، (دوم) اللہ کا دھیان رکھ تو تم اللہ کو اپنے سامنے موجود پاؤ گے، جب تو سوال کرے تو صرف اللہ سے کر، جب تو مدد چاہے تو اللہ سے مدد طلب کر۔ (سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع، ۴: ۶۶۷، الرقم: ۲۵۱۶)

اس حدیث شریف میں ساری چیزیں اہم ہیں، ایک اہم چیز اللہ کے دھیان کو جمانے کے نتیجے میں اللہ کو اپنے سامنے موجود پانے کی خوش خبری ہے، اللہ کا دھیان ایسی چیز ہے کہ جب مسلسل ایسا کرنے سے وہ مستحکم ہونے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا اللہ سامنے موجود ہے، اللہ کے سامنے موجود ہونے کے احساس کے غلبے کی وجہ سے گناہوں اور غفلت کی زندگی سے بچاؤ کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے، اہل اللہ کے ہاں اللہ کے اسم ذات کے ذکر کا دھیاں جمانے کی جو مشقیں ہوتی ہیں، وہ اس حدیث سے ماخوذ ہے، جس سے تقویٰ اور خشیت کا رنگ پیدا ہونے لگتا ہے۔

اللہ کے لئے محبت کرنے والے سے

اللہ کی محبت کا ہونا

فرمایا: ایک شخص اپنے بھائی سے ملاقات کے لئے دوسری بستی میں گیا، اللہ نے اس کے راستے میں فرشتے کو بٹھا دیا، پس وہ فرد جب اس فرشتے کے پاس پہنچا تو فرشتے نے اس سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو، اس نے جواب دیا، میں اس بستی میں اپنے ایک بھائی سے ملنے جارہا ہوں،

فرشتے نے کہا، کیا تیرا اس پر کوئی احسان ہے، جس کا تم بدلہ لینے جارہے ہو، تو اس نے جواب دیا نہیں، میں تو صرف اللہ کے لئے اس سے محبت کرتا ہوں، فرشتے نے جواب دیا، پس میں اللہ کی طرف سے تیری طرف بھیجا گیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ایسے ہی محبت کرتا ہے جیسے تم اس (اللہ) کی خاطر اس (بندے) سے محبت کرتے ہو۔ (مسند اسحاق حدیث نمبر: ۵۴۵)

اللہ کے لئے محبت کرنے اور اس کے لئے سفر کر کے وہاں جانے کی اہمیت کے سلسلے میں یہ بہت اہم حدیث ہے، ہمارا ایک دور تھا جب اللہ کی محبت کی خاطر اللہ کے مقرب بندوں سے ملاقات اور ان کے ہاں قیام کرنے کا رواج مستحکم تھا، اللہ والوں کی خانقاہیں ہر وقت دور دراز سے آنے والے افراد سے بھری رہتی تھیں، اور لوگ ان خانقاہوں میں اللہ کی محبت کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے ٹھیرتے تھے، اللہ کے مقرب بندوں کی ہر وقت کی صحبت اور ذکر کی وجہ سے دلوں سے غیروں کی محبت کے اثرات نکلنے لگتے تھے، اس طرح افراد محض اللہ کے لئے جینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے تھے، اس وقت ہمارا یہ نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، اب اللہ کی محبت کی خاطر ملنے کا رواج بُری طرح متاثر ہے، جو بڑے المیہ کی بات ہے۔

تین خصلتوں سے ایمان کی مٹھاس پانا

فرمایا: جس شخص میں تین خصلتیں موجود ہوں، اس نے ایمان کی مٹھاس کو پالیا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ وہ کسی انسان سے محض اللہ کی رضا کے لئے محبت رکھے، تیسرے یہ کہ وہ کفر میں واپس لوٹنے کو ایسا ہی بُرا جانے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو بُرا جانتا ہے۔ (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۵)

اس حدیث شریف میں ایمان کی مٹھاس کی علامتیں بیان فرمائی گئیں ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی محبت ساری محبتوں پر غالب ہو، شخصیت پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت غالب ہو، اس کے لئے نفس اور مادیت پرست قوتوں سے عرصے تک معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے اور راہ محبت میں چلنا پڑتا ہے، جب تک خواہشات نفس کا زور نہیں ٹوٹتا، تب تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، نفس سنور کر کے فطرت میں موجود جذبات محبت سے ہمہ آہنگ ہو جائے تو اس کے بعد کہیں جا کر اللہ اور اس کے رسول کی محبت مزاج کا حصہ بن جاتی ہے، مزاج میں جب یہ محبت رچ بس جاتی ہے تو دوسری چیزیں آسان ہونے لگتی ہیں، پھر اللہ کے لئے دوسروں سے محبت کرنا اور کفر سے نفرت کے لئے الگ سے مجاہدوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔